ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۲۶

تیسرا سال: دوسری کتاب

فروری ۲۰۰۵ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey@poetic.com
فون: ۰۶۱-۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

کمپوزنگ: اظہر خان (یونی کارن کمپیوٹرز چونگی نمبر ۶ ملتان)
مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ مشفق خواجہ کتاب نہیں، چلتی پھرتی کتابیات — ڈاکٹر انوار احمد — ۵
۳۔ غالبؔ کا ذوقِ الٰہیات، مشکور حسین یاد کی نظر میں — روبینہ شاہین — ۸
۴۔ جمالیات کیا ہے؟ — GANedbzhiwin / شگفتہ حسین — ۱۷
۵۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات: ۱۴) — ابن حسن — ۲۳

ممتاز اطہر کی نظمیں: خصوصی مطالعہ

۶۔ ممتاز اطہر: نئی سمتوں کا سفر — مرتب — ۳۴
۷۔ ممتاز اطہر کی نظمیں — ۳۵

کہانیاں:

۸۔ پاگل آدمی کی ڈائری (چینی ادب) — لوشون / خالد فتح محمد — ۵۶
۹۔ مسجد کی آنکھیں (سندھی ادب) — انور کاکا / ننگر چنا — ۶۶
۱۰۔ خلش — لیاقت علی — ۷۰

شاعری:

۱۱ اقدار کی صلیب (نظم) سجاد مرزا، — ۷۵
قاضی حبیب الرحمٰن (چار غزلیں)، ڈاکٹر انور سدید (دو غزلیں)، خاور اعجاز (چھ غزلیں)
حصیر نوری (چار غزلیں)، شارق بلیاوی (دو غزلیں)، صابر عظیم آبادی (دو غزلیں)،
منیر راہی (دو غزلیں)، صاحب نوید (ایک غزل)، ظفر اقبال نادر (ایک غزل)

حروفِ زر:

۱۲۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۹۰

سید عامر سہیل

چند باتیں

لفظ کا سورج انسان کے ضمیر سے طلوع ہوتا ہے۔ اچھے، برے، پُر تاثیر، بے اثر، نرم، گرم، کڑوے، میٹھے، یہ سبھی لفظ جذبوں میں ڈھل کر نسل در نسل اپنا اعجاز دیکھاتے رہتے ہیں۔ اسی سے فکر و شعور کی کرن پھوٹتی ہے اور اسی سے انسان اپنی وقعت اور شناخت کا تعین کرتا ہے، تاہم دیکھنے والی بات یہ ہے کہ لکھنے والا کن لفظوں پر دلوں کی بعیتیں کرتا ہے اور پھر وہ لفظ اس کے ہونے یا مٹ جانے کا حوالہ کس طور بنتے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے لفظوں کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی باندھ رکھی ہے اور اس بات پر نازاں ہیں کہ لفظ ہمارے کچھ بھی نہ کرنے (یا غلط کرنے) کا کفارہ ادا کر دیں گے۔ لیکن شاید یہ ان لوگوں کی خوش فہمی یا غلط فہمی ہوتی ہے--- لفظ اپنے ہونے کا جواز مانگتے ہیں اور اگر لکھنے والے کے پاس کوئی جواز نہ ہو اور اس نے محض لفظوں کا اسراف کیا ہو تو پھر یہی لفظ اس کی بے توقیری کا سبب بن جاتے ہیں۔ وہی لفظ، لکھنے والے کا محافظ ہوگا جو روح کی منجدھار سے ہو کر نکلے گا۔ خوشامدیوں اور درباریوں کے اسلوبِ زیست، اندازِ تکلم اور ذخیرۂ الفاظ کا سارا زور اپنی جگہ؛ مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ سبھی لوگ اپنے ہی لکھے اور ادا کئے ہوئے الفاظ کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں اور یہ قتل بھی ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو زبانِ خنجر بولتی ہے اور نہ ہی آستین کا لہو پکارتا ہے۔ ہمارے گرد و پیش کی علمی و ادبی فضا (اگر اب اسے فضا کہا جا سکتا ہو تو؟) میں یہی صورتِ حال نمایاں ہے۔ سالہا سال تک لفظوں سے کھیلنے والے، انہیں غلام سمجھنے اور انہیں اپنی منشا و من چاہے طریقے سے استعمال کرنے والے اپنے ہی لکھے لفظوں کے ہاتھوں غلام بنتے اور قتل ہو جاتے ہیں۔ ان کی عظیم شخصیت اپنا ہی بوجھ برداشت نہیں کر پاتی۔ کمال ہے اور واقعی کمال ہے کہ لکھاری کے لکھے گئے الفاظ ساری عمر (پر مرنے کے بعد) اس کا تعاقب کرتے ہیں، وہ اپنے لکھنے والے کو تلاش کرتے ہیں، اسے گھیرتے ہیں، بار بار اپنی تصدیق کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر انہیں جھٹلایا جائے تو وہی اس کی دائمی موت کا سامان کرتے اور اسے گم نامی اور کے اندھیروں میں غرق کر دیتے ہیں۔

''انگارے'' کے حوالے سے، جیسا کہ ہمیشہ کہا گیا ہے؛ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ پرچہ تمام تر شک و شبہ سے بالاتر ہو کر ترقی پسند ادب اور فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ تاہم کبھی کبھار یہ بات پڑھنے اور سننے کو مل جاتی ہے کہ اس حوالے سے بعض احباب کچھ ذہنی و فکری تحفظات رکھتے ہیں۔ مراد یہ کہ ''انگارے'' میں بعض تحریریں اس کے مزاج اور بنیادی نقطہ نظر سے متضاد شائع ہو جاتی ہیں نیز یہ کہ ''انگارے'' میں ترقی پسند قلم کاروں کا منہ چڑایا گیا ہے (بحوالہ حروفِ زر)--- یقیناً یہ باتیں قابل غور ہیں

کہ ایک واضح لائین رکھنے کے باوجود ''انگارے'' میں یہ تضاد کیوں کر نظر آتا ہے؟

جہاں تک فکری تضاد کے زاویہ سے دیکھنے کا تعلق ہے تو شاید میں اس رائے سے اتفاق نہ کر سکوں۔ پرچے میں شائع ہونے والی اکثر تحریریں، مستقل سلسلے اور اداریے اس بارے میں مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مضامین اور حروفِ زر کے مباحث کے حوالے سے یہ اندازہ ممکن ہے لگایا گیا ہو۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ ''انگارے'' کے صفحات لکھنے والوں کے لئے کھلے ہیں۔ پرچے کی پیشانی پر ''غیر متعلقہ افراد کا داخلہ ممنوع ہے'' نہیں لکھا گیا بلکہ لکھنے والوں (خواہ وہ کسی بھی نقطہ نظر کے حامل ہوں) کو دعوتِ فکر کی گئی ہے تا کہ مسائل و افکار کے در وا رہیں۔ علمی و ادبی حوالے سے یہ ایک جمہوری رویہ ہے جس کی کمی لوگوں اور معاشرے میں شدت سے محسوس کی جاتی ہے اور جہاں تک ''انگارے'' کے فکری میلانات کا تعلق ہے وہ بہت واضح اور نمایاں ہیں۔

''انگارے'' کے حوالے سے اس رائے کو قائم کرنے کے پس منظر میں اگر کسی ''بڑی شخصیت'' کا نیم سرکاری ادبی ادارے کی سربراہی والا معاملہ ہے تو شاید ایسا ممکن ہو کیونکہ آج کل یہ بحث زوروں پر ہے۔ ہر دو اطراف سے اس موضوع پر لکھا جا رہا ہے اور کافی سخت باتیں ہو رہی ہیں۔ ''انگارے'' میں بھی یہ بحث خطوط کے حوالے سے چلی ہے تاہم ہمارا موقف شخصی طرف داری یا مخالفت نہیں ہے کیونکہ ہمارے خیال میں یہ معاملہ نظریاتی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔ ہاں البتہ علمی و ادبی ادارے کی کارکردگی، اس کی اہمیت، اسے ذاتی کاروبار کے لئے استعمال کرنا اور بڑے لوگوں کا آنے والوں کو جگہ نہ دینے کا رویہ وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن پر گفتگو ہو سکتی ہے کیونکہ ان کا تعلق کسی ایک خاص شخصیت سے نہیں بلکہ ہمارے اجتماعی رویے اور صورت حال سے ہے۔ یہاں ایک اور بات مدِ نظر رہنی چاہیے کہ ترقی پسندی ایک نظریے اور اسلوبِ زیست کا نام ہے جس کے اپنے اعلیٰ معیارات اور مقاصد ہیں اور جس کا تعلق سماج کی اجتماعی زندگی اور اس کے فکری میلانات و کارکردگی سے ہے، یہاں ذاتیات، ذاتی برتری اور شخصیت پرستی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ کتنے ہی بڑے رتبے کا حامل کیوں نہ ہو نظریے سے بالاتر نہیں ہو سکتا لہٰذا اگر ہم نظریے کو ذاتی پسند و ناپسند کے عینک سے دیکھیں گے تو یہ رویہ کچھ اور تو ہو سکتا ہے ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ اور آخری بات وہی لفظ والی کہ لفظ خود ثابت کرے گا کہ کون کیا تھا اور پھر کیا ہو گیا اور اس سفر میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا-----

☆☆☆

ڈاکٹر انوار احمد

مشفق خواجہ، کتاب نہیں، چلتی پھرتی کتابیات

تحقیق و تنقید اور فکاہات میں مشفق خواجہ اور خامہ بگوش کا نام بہت معروف تھا اور ہے۔ ان کے کتاب خانے کی علمی منزلت بھی مسلمہ ہے، مگر میرے ساتھ بدقسمتی یہ ہے کہ ضیاء الحق کے دور میں جماعتِ اسلامی سے وابستہ بعض افراد نے جس طرح مجھے اور میرے احباب کو ذہنی و جذباتی عقوبت دی (اسلام دشمن، پاکستان دشمن وغیرہ کے القابات عطا کر کے، انکوائریاں، وارنٹ گرفتاری - مارچ ۱۹۸۱) اسکے سبب میرے نزدیک تعلیم یافتہ لوگوں بلکہ پاکستانیوں کی دو قسمیں ہوگئیں، ایک جماعتِ اسلامی سے وابستہ، دوسرے ان سے بآواز بلند اختلاف رکھنے والے۔ مشفق خواجہ کی عمومی شہرت جماعتِ اسلامی سے ہمدردی رکھنے والے کی تھی، وہ جسارت، میں لکھتے تھے ہفت روزہ 'تکبیر' کی مجلسِ ادارت یا مجلسِ مشاورت میں شامل تھے اور جماعتِ اسلامی کے مویدا ساتذہ کی تنظیم، تنظیم اساتذہ کے فعال ارکان کے علمی مددگار ہوتے تھے، انہیں کتب اور جرائد فراہم کرتے تھے۔ مخطوطات کی نقول عطا کرتے تھے اور یوں متعلقہ تحقیقی مواد تک رسائی کو ارزاں بناتے تھے، حتیٰ کہ وہ ملتان آ کر جھنڈیر لائبریری میں گئے تو اخبار میں ان کی معیت میں وہاں جانے والے ملتان کے جن اساتذہ کے نام تھے، وہ بھی ہم جیسے خطا کاروں سے ان کا ذہنی فاصلہ بڑھانے والوں میں سے تھے، سو میں ان لوگوں میں سے ہوں جو مشفق خواجہ سے بہت بعد میں ملا اور ایک دو جھڑپوں کے بعد ان سے محبت اور احترام کرنے والوں میں شامل ہوگیا۔

۲۰۰۲ء میں اسلام آباد میں کمالِ فن ایوارڈ کی جیوری میں میں بھی مشفق خواجہ، فتح محمد ملک اور انتظار حسین کے ساتھ شامل تھا، یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی، افتخار عارف کے کمرے میں بیٹھے ہوئے انہوں نے یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق کا ذکر چھیڑا اور ہماری یونیورسٹی (زکریا یونیورسٹی، ملتان) کا ذکر بطرز تعریض کیا، میں ان کی عمر اور علمی مرتبے سے بے نیاز ہو کر صلاح الدین حیدر کے اسلوب میں ان سے الجھ گیا، انہوں نے ادبی جرائد پر پی ایچ - ڈی کے مقالات لکھوانے کی روش پر اعتراض کیا (ڈاکٹر شگفتہ حسین کا مقالہ بحوالہ ادب لطیف اور ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز کا مقالہ بحوالہ ساقی)، میں نے جس پیرائے میں گفتگو کی اس سے محفل پر سناٹا طاری ہوگیا کیونکہ سبھی مشفق خواجہ کا بے پناہ احترام کرتے تھے، کچھ دیر کے بعد مجھے بھی اپنے اندازِ تکلم پر ندامت ہوئی، مگر انہوں نے مجھے اسکے اظہار کی شرمندگی سے بچالیا، بہت گرمجوشی سے باقی وقت باتیں کرتے رہے اور ہمارے شعبے کے چند استادوں نے مل کر جو ریسرچ لائبریری (خلیل صدیقی ریسرچ لائبریری) قائم کی ہے، اس میں گوشہء قدرت نقوی بنانے کے اعلان کے ساتھ وعدہ کیا کہ میں جلد از جلد کتب کا عطیہ بھی روانہ کروں گا اور اسکے لئے انہوں نے وعدہ ایک قسط

کی صورت میں پورا بھی کیا. اسی ملاقات میں انہوں نے مجھے غنچہ امروہوی کے باغ و بہار (ملتان سے ۱۹۳۳ میں جاری ہونے والا ادبی جریدہ) کے شمارے تلاش کرنے کو کہا اور میں نے تین ماہ کی کاوش کے بعد انہیں پانچ شماروں کی فوٹو کاپیاں روانہ کیں، یاس یگانہ چنگیزی کا کلام اس میں شائع ہوتا تھا اور وہ یاس یگانہ چنگیزی کی کلیات اس زمانے میں ایڈٹ کر رہے تھے۔ اگرچہ میری اُن سے ملاقاتیں گنتی کی یعنی چار تھیں اور میری شخصی نیاز مندی کا سلسلہ بھی ہرگز دراز نہیں، میں ان کی خلوت تو کیا جلوت کے بارے میں بھی بہت کم جانتا ہوں مگر اتنا کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ وہ چلتی پھرتی کتاب نہیں، کتابیات تھے۔ دو سے زیادہ مرتبہ تو ملتان سے فون کر کے میں نے اپنے کسی مضمون کے سلسلے میں ان سے استفسارات کیے اور جس طرح فوراً انھوں نے اس بارے میں جوابات دیئے، اس سے میرا حوصلہ اور بڑھا اور ممنونیت میں اضافہ ہوا۔ میرا خیال یہ ہے کہ علمی درس گاہیں تحقیق کے سلسلے میں حقیقی کردار اس وقت محض موجود اساتذہ کی مدد سے نہیں ادا کر سکتیں، ہاں مگر اس ملک میں موجود اصحابِ علم کی گرم جوش اعانت اور تنقیدی رہنمائی انھیں میسر آئے تو وہ اپنے تحقیقی کام کا علمی اعتبار قائم کر سکیں گی۔ اسی لیے ہم نے ہمیشہ اپنے شعبے میں پروفیسر خلیل صدیقی مرحوم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر رشید امجد سے نصاب سازی سے لے کر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے موضوعات کے سلسلے میں مشاورت کرتے رہے ہیں اور ہمارے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ ہمیں بہت دیر سے سہی مگر ایسی تنقیدی رہنمائی جناب مشفق خواجہ کی ذات سے بھی میسر آئی۔ سو شعبہ اردو کی ریسرچ سکالر، شازیہ عنبرین کو ''اُردو تحقیق کی روایت میں مولوی عبدالحق کا مقام'' کا موضوع پی ایچ ڈی کے لیے جناب مشفق خواجہ نے ہی تجویز کیا تھا اور فروری کے دوسرے ہفتے میں نے فون پر اُن سے رابطہ کر کے درخواست کی تھی کہ اب شازیہ عنبرین کا تحقیقی مقالہ اس مرحلے میں ہے کہ ان کے ذخیرۂ علم اور ذات سے استفادہ بہت ضروری ہے۔ انھوں نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی، میں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب سے فون پر ہی اس ریسرچ سکالر کے کراچی میں قیام کے حوالے سے مدد کی درخواست کی۔ جسے انھوں نے حسبِ سابق کشادہ دلی سے اپنے ذمے لیا مگر دو دن کے بعد ڈاکٹر شگفتہ حسین نے جناب مشفق خواجہ کا پیغام دیا کہ شازیہ ان کے پاس مارچ کے پہلے ہفتے میں آئے کہ ان کے کتاب خانے میں ان کا کارکن یا معاون چھٹی لے کر ملتان گیا ہے، اس کی واپسی پر ہی یہ ممکن ہو سکے گا۔ اس معاون کے ہاتھ انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے شائع ہونے والے نہایت وقیع علمی ریسرچ جرنل ''جریدہ'' کی چار کاپیاں بھی بھجوائیں مگر ۲۲ر فروری کی رات کو اسلام آباد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑی افسردگی کے ساتھ مجھے بتایا کہ خواجہ صاحب ہسپتال میں داخل ہیں اور وہ اس میٹنگ کے لیے اسلام آباد میں آتے وقت اپنی اہلیہ کو مشفق خواجہ کی بیگم کے پاس ہسپتال میں چھوڑ کر آئے ہیں اور صبح تک وہ افسوس ناک خبر سننے کو ملی جس کے بعد قحط الرجال کے اس عالم میں ایک اور غیر معمولی شخصیت سے

محرومی کا ملال بڑھ گیا۔

میں نے جیسے پہلے عرض کیا کہ میری اُن سے ایسی قربت نہیں تھی کہ میں اُن کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں پر تبصرہ کرسکوں، وہ بلاشبہ عالم بے بدل تھے، بذلہ سنج تھے، محفل آرا تھے، کشادہ دل اور وضع دار تھے، مگر میرا گمان ہے کہ کچھ لوگوں سے علمی حساب کتاب چکانے کے بعض طلب گاروں کی مطلوب اور نامطلوب علمی مدد بھی کیا کرتے تھے، سو ابھی گزشتہ برس 'کمالِ فن ایوارڈ' کی جیوری کی ایک میٹنگ میں میں پھر اُن کے ہمراہ تھا، اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد کے رائٹرز ہاسٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے اور میں دو سے زیادہ مرتبہ اُن کی مجلسوں میں دیر تک بیٹھا، اسی طرح کی ایک مجلس تھی، جس میں میں نے قیاس کیا کہ کچھ لوگ بعض ایسی کتابوں کے سلسلے میں ان سے علمی امداد چاہتے ہیں جو موضوع بننے والی شخصیتوں کا علمی اعتبار تو گھٹاتی ہی ہے مگر مصنفوں اور مرتبوں کی عزت میں بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ سو میں نے بڑے ادب سے مگر با آواز بلند ڈاکٹر معین الرحمٰن اور مرزا حامد بیگ کے دفاع میں نہیں اُردو کے سبھی اساتذہ اور سبھی مصنفوں کی بچی کھچی عزت کو قائم رکھنے کے حق میں بعض باتیں کیں جو محفل کے رنگ اور مزاج کے منافی تھیں مگر یہ اُن کی عظمت ہے کہ انھوں نے نا صرف سلیقے سے اس موضوع کو تبدیل کیا بلکہ اگلی ملاقات میں میری کہی ہوئی بعض باتوں کے سلسلے میں کچھ توضیح طلب سوالات بھی کیے۔ یہ وہ جیوری تھی جس نے محترمہ ادا جعفری کو اس سلسلے میں نامزد کیا اور ایک خاتون رکن نے اختلافی نوٹ لکھا۔ اُن سے میری آخری ملاقات ۲۵ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو کراچی میں ہوئی تھی جہاں میں، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر ظفر عالم ظفری ''یادگارِ نگار و نیاز'' کی تقریب میں مقالات پڑھنے گئے تھے، مشفق خواجہ اس محفل میں تو موجود نہیں تھے البتہ کراچی کے ایک خدا ترس شخص نے تمام مہمانوں کو عشائیے کے لیے اپنے گھر میں اس طرح سے مدعو کیا تھا کہ وہاں ایک شان دار شامیانہ لگا تھا اور موسیقی کے لیے سٹیج بھی بنایا گیا تھا۔ مگر ہم سب ایسے خستہ حال اور بد ذوق تھے کہ موسیقی پر کھانے کو اور نیند کو ترجیح دینے پر مجبور تھے، یہیں مشفق خواجہ صاحب موجود تھے اور جب ہم سب کھانا کھا کر میزبان کے سینے پر مونگ دلتے ہوئے موسیقی سنے بغیر اس گھر سے روانہ ہو رہے تھے تو خواجہ صاحب ہم سب کا کفارہ ادا کرنے کے لیے وہاں بیٹھے تھے اور اس حوصلے کے ساتھ کہ وہ نصف شب گزرنے کے بعد بھی وہاں بیٹھے رہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

روبینہ شاہین

غالب کا ذوقِ الٰہیات مشکور حسین یاد کی نظر میں

غالب کی تفہیم کے سلسلہ میں نت نئے تجربات اور خیالات منظر پر آتے رہتے ہیں۔ مختلف شارحین نے غالب کے اشعار کی جو وضاحت پیش کی ہے انہیں نئے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت بھی ہے اور تفہیم غالب کے لیے آج کے پس منظر کا مخصوص حوالہ بھی جہانِ معنی کو وسیع کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس ضمن میں سید مشکور حسین یاد نے ایک کوشش ''غالب کا ذوقِ الٰہیات'' کے نام سے پیش کی ہے۔ وہ دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''میں غالب کی الٰہیات کے بجائے اس کے ذوقِ الٰہیات پر اس لیے بات کرنا چاہتا ہوں کہ الٰہیات سے یعنی اللہ اور اس کی ذات سے تو ہر انسان کا تعلق ہوتا ہے لیکن یہ تعلق کس قسم کا ہے اس سے ہر انسان کی انسانیت کا پتا چلتا ہے۔ بس اسی پتہ چلنے کو میں نے یہاں ''ذوقِ الٰہیات'' کا نام دیا ہے۔'' (ص ۷)

حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کا خالقِ حقیقی سے خاص رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ کوئی رب کو خوف کے آئینے میں دیکھتا ہے، کوئی دوستی کے، کوئی عقیدے میں اور کوئی عقیدت سے۔ غرض ہر اک کے ذہن میں رب کا تصور مختلف ہے۔ غالب ایک شاعر کی حیثیت سے حقیقتِ عظمیٰ کے ساتھ کس طرح تعلق قائم کرتا ہے اور اس کی روزمرہ زندگی میں اس کے کیا اثرات تھے یہ کتاب اس موضوع سے بحث کرتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کو چند حصوں میں تقسیم کر کے اس کے مصنف کی غایت تک رسائی ممکن ہے۔ اس کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی اس تقسیم سے اُجاگر کیا جاسکتا ہے۔

(i) اُن اشعار کی تفصیل و تشریح جن میں ذوقِ الٰہیات کا پہلو نمایاں ہے۔

(ii) اُن اشعار کی وضاحت جن میں ذوقِ الٰہیات کا عنصر دیا ہوا ہے اور مختلف شارحینِ غالب سے پوشیدہ رہا، مشکور حسین یاد نے اس کی توضیح و تشریح کرنے کی کوشش کی۔

(iii) اشعار میں موجود مختلف ''لفظیات'' کے نئے معانی (مشکور حسین یاد کی نظر میں)

(iv) اشعار میں موجود وہ ''لفظیات'' جن کا ذوقِ الٰہیات سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن مشکور حسین یاد نے محض اپنے دلائل کو مضبوط بنانے کے لیے ان سے مخصوص مطالب اخذ کیے ہیں۔

اس ضمن میں کتاب میں شامل ان اشعار کو زیرِ بحث لایا جائے گا جن کے بارے میں مختلف شارحین کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ اشعار حقیقتِ عظمیٰ کے بارے میں ہیں لیکن مشکور یاد نے ان کی نئی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض شارحین سے اختلاف کیا ہے۔ کتاب میں صفحہ ۲۷ پر غالب کا شہرۂ آفاق

شعر موجود ہے جسے تفہیم کا نیا زاویہ دیا گیا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مشکور حسین یاد نے اعتراف کیا ہے کہ اس شعر کی کافی شرحیں ہیں لیکن اس شعر کو غالب کے ذوقِ الٰہیات کے تحت سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس طرح اس شعر کا مفہوم روایتی مطلب سے کہیں آگے نکل جائے گا۔ مصنف کا خیال ہے کہ لفظ ''شوخی'' میں شعر کی اصل روح قید ہے۔ یعنی رب نے پوری کائنات کو کاغذی لباس پہنا کر فریادی بنایا ہے۔ نقش کائنات کی فریاد یہ ہے کہ اس کے خالق یعنی اس کے بنانے والے نے اس کے ایک ایک خدوخال میں بلا کی شوخی بھر دی ہے جس کی وجہ سے ایک تو اس پر کسی جگہ بھی کسی کی کوئی نظر نہیں ٹھہرتی۔ نقش کائنات نازک اور بہت خوب صورت ہے۔ اتنا خوب صورت کہ ہمارے حواس بھی پوری طرح اس کا ادراک نہیں کر سکتے لیکن ہماری نارسائی کے علاوہ دکھ کی دوسری بات یہ ہے کہ نقشِ کائنات فنا ہونے والا ہے۔ ایسی نازک ایسی خوب صورت اور ایسی معنی خیز چیز کے مٹ جانے کا احساس بھی تکلیف دہ ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو غالب کہنا چاہتے ہیں کہ کائنات فانی نہیں بلکہ اس کائنات کا پیرہن اس کا لباس کاغذی اور فانی ہے۔ کائنات کا باطن فانی نہیں صرف کائنات کا ظاہر فانی ہے اور وہ بھی فانی کیا ہے فنا ایک طرح کا پردہ ہے جو ادراکِ معنی کی خاطر اُٹھانے کے لیے ڈالا گیا ہے۔ مشکور صاحب کا خیال ہے کہ غالب کے ذوقِ الٰہیات نے ایک لفظ ''شوخی'' سے معانی سے پردے اُٹھائے ہیں اور کائنات کا سب سے بڑا راز یعنی رازِ فنا خوب صورتی کے ساتھ فاش کیا ہے۔ مصنف نے نہایت سوچ و بچار کے بعد اس شعر کو موضوع بنایا ہے اور شعر کے معانی کو زیادہ وسیع اور آسان بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی محنت اور ذہنی رسائی قابلِ داد ہے۔

کتاب کے صفحہ ۳۵ پر غالب کے اس شعر کو کفر و ایمان کے ضمن میں موضوع بنایا گیا ہے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر　　کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عموماً اس شعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شعر انسان کی کشمکش کفر و ایمان کا ایک عمدہ نمونہ ہے لیکن مصنف کے نزدیک یہ شعر انسان کے حوالے سے کفر اور ایمان کی الگ الگ کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔ ایمان سے تو کشمکش کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ایمان انسان کی اس کیفیت قلب کا نام ہے جس میں سکون اور امن ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ کفر کے کھینچنے کا فعل واضح کر رہا ہے کہ اسے نہ اپنے پر اعتماد ہے اور نہ اس پر جسے وہ کھینچ یا گھسیٹ رہا ہے۔ ایمان کے روکنے میں جو خود اعتمادی ہے کفر کے کھینچنے میں اس کا دُور دُور بھی پتا نہیں چل رہا۔ اب شعر کے دوسرے مصرع کی طرف توجہ دی جائے تو ___ کعبہ مرے پیچھے کلیسا مرے آگے ___ اس کا مطلب بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ایمان کے روکنے اور کفر کے کھینچنے کے فعل پر انسان کو پوری طرح غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورت حال ایسی نہیں ہے جس پر سے سرسری گزرا جائے۔ غالب نے اس شعر میں کعبے کو پیچھے رکھ کر ایمان کی استقامت کو واضح کیا ہے اور کلیسا

کو آگے رکھ کر کفر کی بوکھلاہٹ کا پول کھول دیا ہے اور عام آدمی کفر کے کھینچنے ہی کے فعل کو کشش سے تعبیر کرے اور غور و فکر سے کام نہ لے تو شعر پوری روح کے ساتھ سامنے نہیں آ سکتا۔

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے مصنف خود قدرے کنفیوز ہو گئے ہیں۔ دراصل جو تشریح ان کے دل و دماغ میں موجود ہے اسے پوری طرح واضح کرنے سے قاصر لگتے ہیں۔ اس مطلب کو انہوں نے کافی پیچیدہ اور گنجلک بنا کر پیش کیا ہے اور غالب کے ذوقِ الٰہیات کی تلاش میں تقریباً ناکام رہے ہیں۔

کتاب کے صفحہ ۴۸ پر غالب کے دو مسلسل اشعار کو موضوع بنایا گیا ہے

نہ سنو گر برا کہے کوئی　　نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخش دو گر خطا کرے کوئی

مصنف کا خیال ہے کہ اوامر و نواہی انسانی معاشرے کے حوالے سے الٰہیات کا ایک بہت ہی بڑا مسئلہ ہے بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو انسانی معاشرے میں کس بات کی اجازت ہونی چاہیے اور کس بات کی ممانعت، یہی بات اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے لیے غالب نے یہ حل پیش کیا ہے کہ پہلے آدمی اپنی سماعت پر قابو پائے یعنی کیا بات سننی ہے اور کیا بات کہنی ہے یعنی زبان پر قابو پائے پھر وہ غلط چلنے والے کو غلط چلنے سے آسانی سے روک سکتا ہے اور اس طرح اس میں اتنی ہمت اور حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خطا کرنے والے کی خطا کو معاف کر دے۔ اب جہاں یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں اس معاشرے کو آئیڈیل انسانی معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت واضح اور مربوط انداز میں ان اشعار کی نئی تشریح کی ہے اور تفہیم شعر کا نیا دَر وا کیا ہے۔

کتاب کے صفحہ ۵۸ پر غالب کی ایک پوری غزل کو ذوقِ الٰہیات کے سلسلہ میں موضوع بنا کر نئے معانی پہنائے گئے ہیں

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نُور کی　　قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اگر تجلی کو یعنی مکمل اظہار کو کوئی شکل قابلِ قبول تھی تو یہ تیری شکل کی صورت میں منظور تھی۔ اس لیے تیرے قد اور رُخ کی وجہ سے یا صدقے میں ظہور کی قسمت کھلی ہے۔ نور یعنی روشنی اپنے آپ کو ظاہر تو کرنا چاہتی تھی کیونکہ نور یا روشنی کا کام ظاہر ہونا ہی نہیں ہے ظاہر کرنا بھی ہے۔ ایک طرح خالق نے پوری کائنات کو بنا ڈالا یا اس کو ظاہر کر ڈالا لیکن جس طرح وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا ابھی تک اظہار نہیں ہو رہا تھا لیکن جیسے ہی حضور کی ذاتِ اقدس کا ظہور ہوا تو گویا خود ظاہر کرنے والے کو یہ احساس ہوا کہ جس طرح مکمل طور پر میں ظاہر کرنا چاہتا تھا وہ اظہار اب ہوا ہے۔ اس غزل کے چھٹے شعر میں بھی ذوقِ الٰہیات کا پہلو نمایاں ہے

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　　کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

یہاں مشکور حسین یاد مولانا غلام رسول مہر کی شرح پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ مرزا غالب نے کعبے سے بتوں کی نسبت کے متعلق جو استدلال کیا ہے ظاہر ہے کہ

وہ منطقی نہیں شاعرانہ ہے اسے منطق کی ترازو میں نہ تولنا چاہیے۔ مصنف کے نزدیک غالب کا شاعرانہ استدلال اکثر و بیشتر منطقی ہوتا ہے۔ اس طرح زیر بحث شعر میں بھی غالب نے ''نری'' شاعری نہیں کی انسان کے نظریہ الٰہیات پر مجموعی طور پر ایک کڑا محاکمہ کیا ہے اس محاکمہ کا لہجہ سخت یا نرم ہونے کی بجائے فکر انگیز اعتدال لیے ہوئے ہے۔ بُت پرستوں پر حقارت کی نظر ڈالنے کی بجائے حریت فکر کے ساتھ انسان کی تاریخ پر ستش پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی، کہنے کا مطلب ہے کہ الٰہیات کی تاریخ کو دُور تک دیکھنے کی ضرورت ہے اور یہ تاریخ ابھی تک اچھی طرح معروضی انداز میں کھنگالی نہیں گئی۔

اس شعر کی تشریح کرتے وقت مصنف کی ذہنی رسائی قابل توجہ ضرور ہے یہاں انہوں نے غالب کے اس شعر کے لب ولہجہ پر غور کرتے ہوئے وضاحت کی ہے۔ درحقیقت شعر کا لہجہ اسے بلند پایہ بنا دیتا ہے۔ لہجہ کی عظمت فکر کی عظمت کے اظہار کے لیے لازمی شے ہے۔ خزانوں تک رسائی محض ''کھل جا سم سم'' سے نہیں ہوتی بلکہ یہ خزانے الہ دین کا لہجہ بھی مانگتے ہیں۔ غالب اس نازک نکتے سے خوب واقف تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس شعر میں مصنف نے ان کے لہجہ کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ فکری عظمت کو بھی شدت سے بیان کیا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۱۲۱ پر غالب کے اس شعر کی وضاحت کی گئی ہے

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

مصنف کا خیال ہے جدید دنیا میں سب سے اہم مسئلہ انسان کی تنہائی کا ہے۔ انسان بنیادی طور پر سماجی مخلوق ہے، مل جُل کر رہنا اس کی فطرت ہے، ایسے میں اگر انسان انسان سے بے زار ہو جائے اور اپنی مصروف دنیا میں کھو جائے تو تنہائی انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔ بیگانگی خلق کو دُور کرنے کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا گویا ایک اعتبار سے انسان کا صحیح معنی میں اپنی آزاد خیالی، روشن ضمیری اور بلند حوصلگی کا ظاہر کرنا ہے اور اسی مظاہرے سے حریت فکر و عمل کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اے بندے اگر لوگوں کی تنگ دلی اور تنگ نظری نے تجھے اپنے سے غیر سمجھ لیا ہے تو کیا ہوا تیرے لیے خدا کی وسعتیں ان وسعتوں کے آفاق ہر وقت حاضر ہیں۔

فاضل مصنف نے خوب صورتی کے ساتھ اس شعر کی تشریح کی ہے اور دوسرے مصرعے میں موجود مکالمے کی کیفیت کو گرفت میں لینے کی ضرورت کو پورا کیا ہے کہ غالب نے حقیقی معنوں میں رب کی محبت اور شفقت کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔ مشکور حسین یاد نے عمدگی سے اس شعر میں غالب کے ذوقِ الٰہیات کے نمایاں پہلو کی تشریح کی ہے۔ کتاب کے صفحہ ۱۲۴ پر یہ شعر تشریح کے لیے موجود ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے

مصنف نہایت باریک بینی سے اس شعر کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ ''ہاں'' کی شمولیت کی وجہ یہ ہے کہ غالب عام گفتگو کے لہجے میں بات کرنا چاہتے ہیں

اور اس لفظ سے ان کے اس اعتماد کی نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ جو وہ کہہ رہے ہیں اس پر انہیں یقین کامل ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اس شعر کی تشریح کچھ یوں ہے کہ درویش کے ایک معنی گلی گلی میں صدا لگانے والے شخص کے بھی ہیں۔ ان معنی کے پیش نظر تو غالب کے زیر بحث شعر کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ گلی گلی میں بھلائی کی صدا گونج رہی ہے۔ جس طرح پہلے مصرعے کے لفظ ''ہاں'' سے بھلائی کی ترغیب خوش تدبیر کا آغاز ہوتا ہے اسی طرح دوسرے مصرع کے پہلے ہی لفظ ''اور'' سے بھلائی ساری کائنات پر گھنگور گھٹا کی طرح نہیں بلکہ صبح درخشاں کے مانند چھائی ہوئی اور اپنے اُجالے برساتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کو ماننے کا مطلب بھلائی کو لامحدود ماننے کے مترادف ہے اور ہم بھلائی کو اس بے کرانی کے ساتھ اس وقت تک نہیں مان سکتے جب تک ہمارے قلب ونظر میں وسعت پیدا نہیں ہوتی۔

اس شعر کی تشریح کرتے وقت فاضل مصنف نے ذوقِ الٰہیات کے تصور کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سماجی سطح پر معاشرے میں نیکی کا تصور نہ صرف بلند ہے بلکہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہر مذہب اس کی تلقین و ترغیب دیتا ہے۔ وسیع تر تناظر میں اس شعر کی تشریح اور مدعا نہایت واضح اور مختصر ہے جسے مصنف نے خواہ مخواہ اُلجھا کر پیش کیا ہے۔ راقم الحروف کی ناقص رائے میں یہ عام گفتگو کا شعر ہے اور روزمرہ کے مانوس الفاظ کے برمحل استعمال سے اسے سہل ممتنع بنا دیا گیا اور اس کا مطلب بھی اتنا ہی واضح اور صاف ہے۔ صفحہ ۱۳۳ پر ذوقِ الٰہیات کے سلسلہ میں غالب کے اس شعر کو موضوع بنایا گیا ہے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

جب ابوظفر بہادر شاہ کے سامنے غالب نے یہ شعر پڑھا تو وہ کہنے لگا ''بھئی ہم تو اس وقت بھی ولی نہ سمجھتے۔'' اس پر غالب نے فوراً جواب دیا ''حضور تو مجھے اب بھی ولی ہی سمجھتے ہیں مگر آپ یہ اس لیے فرما رہے ہیں کہ کہیں میں مغرور نہ ہو جاؤں۔'' فاضل مصنف کا خیال ہے کہ غالب کے اس جواب سے بھی واضح طور پر پتہ چل رہا ہے کہ غالب کو خاص معنی میں اپنے ولی ہونے پر تو کوئی شک نہ تھا۔ بادہ خواری میں ایک خواری کا امکان اور اندیشہ تو ہر صورت میں موجود رہتا ہے کہ ہزار احتیاط کے باوصف آدمی کسی وقت بھی اپنے حواس کھو بیٹھے۔ چنانچہ غالب کی بادہ خواری ایک طرح سے اس کے سر پر لٹکی ہوئی ایک تلوار تھی جو ایک طرف تو اسے مغرور ہونے سے بچائے رکھتی ہے اور دوسری طرف حقائق حیات کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیتی تھی۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

مصنف کا خیال ہے کہ یہ ''مسائلِ تصوف'' والے شعر کے دوسرے مصرعے کے پہلے ٹکڑے کی نسبت غالب کو اس کے دوسرے ٹکڑے کا زیادہ خیال تھا یعنی ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' کی اسے یعنی غالب کو اتنی پرواہ نہیں تھی جتنی کہ ''جو نہ بادہ خوار ہوتا'' کے طعنے پر اسے ایک طرح سے ناز تھا۔ یہ طعنہ غالب کو اس کی اپنی حقیقت سے بے خبر یا غافل نہ ہونے دیتا تھا۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دنیادار بھی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا ایک خاص رشتہ حقیقت الحقائق سے بھی قائم رہے۔ گویا غالب اپنی تمام تر

بادہ خواری کے باوجود اپنے ذوقِ الٰہیات کو بھی قائم دائم رکھنا چاہتا تھا تو وہ کوئی انوکھا کام نہیں کر رہا۔

مصنف کے نزدیک غالب کی شخصیت اور فکری پہلو کو سمجھنے میں بڑے بڑے دانشوروں نے بُری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں اور جدید دَور میں خاصے عرصے سے غالب کو مغلوب دکھانے کا جو ایک رجحان چلا آ رہا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اور کچھ نہیں تو اس طرح سے کج فہم لوگ غالب کی شخصیت ہی میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں۔ غالب قمار باز تھا، رنڈی باز تھا بلکہ اس نے عشق بھی کیا تو ایک معمولی سی ڈومنی سے، غالب نے قید بھی کاٹی، انگریزوں کی بُری طرح خوشامد کی محض اپنی پنشن کی خاطر وغیرہ وغیرہ۔ اصل میں غالب کے تصورِ دین و دنیا کے امتزاج کو حریتِ فکر و عمل کی روشنی میں دیکھا جائے تب کہیں جا کر اس کے ولی ہونے کا بھی کچھ پتا چلتا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زبان و بیان کے اعتبار سے غالب کا یہ شعر عام فہم ہی نہیں نہایت مقبول بھی ہے۔ ابلاغ کے لحاظ سے نہایت عمدہ شعر ہے لیکن ذرا غور و فکر کریں تو معانی کے جہاں آباد نظر آتے ہیں۔ اس شعر نے اپنے چہرے پر بظاہر کوئی نقاب نہیں ڈالا ہوا اور سیدھی سادی بات ہے کہ جان کا نذرانہ پیش کیا تو کیا بڑی بات ہے جان اسی کا تحفہ تھی۔ دراصل اس شعر میں غالب نے قربانی اور ایثار کے عام تصور کو بدلا ہے یعنی قربانی میں سب سے بڑی قربانی جان کی قربانی کو سمجھا جاتا ہے جس نے کسی کے لیے جان دی سمجھ لیجیے اس نے سب کچھ دے دیا لیکن غالب کا کہنا یہ ہے کہ جان دے کر کون سا تیر مار لیا۔ جان تو آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہے آپ اسے تو کسی کو دے ہی نہیں سکتے جب تک کہ آپ اس کی رضا حاصل نہ کر لیں جس کی عطا کردہ یہ آپ کی جان ہے۔ جان دینا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی کی دی ہوئی چیز اسی کو واپس دے دی جائے یا اگر کسی اور کو دی تو گویا ایک طرح امانت میں خیانت کے مرتکب ہو گئے۔

اب تک صرف اشعار کا تفصیلاً ذکر ہوا ہے جن میں غالب کے ذوقِ الٰہیات کا تصور واضح ہے۔ اب ان اشعار کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے جن میں مشکور حسین یاد نے خوب زور مارا ہے کہ غالب کے ذوقِ الٰہیات کے نئے پہلوؤں کو سامنے لایا جائے۔ کتاب کے صفحہ ۱۵ پر ذوقِ الٰہیات کی وسعتوں کو اس شعر میں ڈھونڈا گیا ہے

جب کرم رخصت بے باکی و گستاخی دے کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

شارحین غالب نے اس شعر کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور اسے ایک عام محبوب یا معشوق کی ایک خاص مہربانی تک محدود کر کے اس کی تشریح فرمائی ہے جب کہ مشکور حسین یاد کے نزدیک اس شعر میں لفظ ''کرم'' کو وسیع تر معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ عام شرح کے مطابق جب کوئی معشوق اپنے عاشق کو کھل کھیلنے کی خود اجازت دے رہا ہو تو پھر بھی اگر کوئی عاشق اپنے آپ کو رسم تکلف سے باندھ کر کھڑا رہے تو اس سے زیادہ بڑی اس کی کوتاہی اور تقصیر کیا قرار دی جا سکتی ہے۔ مشکور صاحب کا خیال ہے کہ اگر ہم اس شعر کے معنی کو معشوق مجازی تک ہی محدود کر دیتے ہیں تو پھر یہ شعر معنوی اعتبار سے جنسی معاملات سے آگے نہیں بڑھتا اور اس شرح کے سلسلہ میں انہوں نے غلام رسول مہر کو ایک دفعہ پھر

سخت تنقید کا شکار بناتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے اس شعر کے یہ معانی نکالے ہیں کہ ''شعر میں دراصل اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ اصل شے محبوب کی رضا اور خواہش ہے۔ گناہ وہی ہے جو محبوب کی رضا کے خلاف ہو جن اُمور کو از راہِ لطف و نوازش گناہوں سے خارج کر دیا ان کا نہ کرنا یقیناً گناہ سمجھا جانا چاہیے۔'' مشکور صاحب کا خیال ہے کہ اس شعر میں غالب گناہ و ثواب سے بلند ہو کر ایک بات کہہ رہا ہے جس کا انسان کی آزاد خیالی اور روشن ضمیری سے براہِ راست تعلق ہے اور اس کی تشریح کچھ یوں ہے کہ جب کرم نے یعنی سب سے بڑے معشوق نے اپنے عاشقوں کو بے باکی و گستاخی کی عام اجازت دے رکھی ہے تو پھر ایسی صورت میں اس سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی کوتاہی کیا ہو سکتی ہے۔ ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ غور و فکر کرنا بھی ہمارے عمل کا ایک حصہ ہے بلکہ غور و فکر بذاتِ خود ایک ارفع و اعلیٰ عمل ہے چنانچہ حقیقت الحقائق کی طرف سے ہماری حریتِ فکر و عمل پر کوئی قید عائد نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ اپنی خاص مہربانی کے پیشِ نظر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں بے باک اور گستاخ ہونے تک کی اجازت دی ہے۔ آدمی غور و فکر میں بے باک و گستاخ ہوتا ہے تو فرسودہ افکار کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ نئے نئے خیالات سامنے آتے ہیں اور اس طرح آزاد خیالی اور روشن ضمیری کا قافلہ رواں ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۰ پر یہ شعر ذوقِ الٰہیات کو ثابت کرنے کے لیے لایا گیا ہے

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مشکور صاحب نے اس شعر کی تشریح کو حد درجہ اُلجھا کر محض اپنی بات کی دلیل کے لیے استعمال کرنا چاہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس شعر کی تشریح کچھ یوں ہے کہ حضرت غالب بطور انسان ایک عجیب مشکل میں پھنسے ہیں۔ ایک طرف تو وہ جانتے ہیں کہ اطاعت اور زہد اختیار کیا جائے تو ثواب حاصل ہوتا ہے لیکن دوسری طرف ان کی طبیعت نہ اطاعت کے لیے خود کو آمادہ پاتی ہے اور نہ زہد اختیار کرنے کو اس کا جی چاہ رہا ہے، گویا اس وقت علم پر طبیعت یا انسان کی نیچر حاوی ہے۔ اور پھر فاضل مصنف نے ''طبع'' ''ثواب'' جیسی لفظیات کا جائزہ لے کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اطاعت میں عمل و حرکت کا ثبوت ملتا ہے۔ جس طرح اطاعت میں خوشی خوشی کوئی کام کر کے انبساط و بہجت کے نئے دروازے کھلتے ہیں اسی طرح پرہیزگاری اور زہد اختیار کر کے ترغیبات کے انوکھے سے انوکھے آفاق ہمارے حواس کو اپنے اطراف میں کھینچتے اور نو بہ نو امکانات سے پردے اُٹھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا ثواب کی طرف لانے کے لیے طبیعت کو اعمالِ انسانی کی ہمیشہ قائم رہنے والی چہل پہل سے آشنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مشکور صاحب دُور کی کوڑی لائے ہیں اس شعر کا واضح مطلب تو غالب کی اس شوخی کو نمایاں کرتا ہے جو اُن کے مزاج کا خاص حصہ تھی اور اگر اس شعر میں ذوقِ الٰہیات کا پہلو ڈھونڈا جائے تو شاید یہ صورتِ حال سامنے آئے جو اس کتاب میں نظر آتی ہے۔

صفحہ ۵۴ پر غالب کے ایک نہایت خوب صورت شعر کو موضوع بنایا گیا ہے اور مشکور صاحب نے نہایت منطقی اور مدلل انداز میں اس کی تشریح پیش کی۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

زیرِ بحث شعر کے دوسرے مصرع سے صاف پتا چل رہا ہے کہ غالب کو یہ یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ کردہ گناہوں یعنی عام غلطیوں کی کوئی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ لوگ جن غلطیوں کو گناہ سمجھتے ہیں دراصل وہ گناہ نہیں ہوتے آدمی کی بے چین اور بے کل طبیعت کے گونا گوں تجربات ہوتے ہیں جو کسی جستجو کے جذبے کے تحت عمل میں آتے ہیں یا لائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی واقعی بندۂ خدا ہے تو اس سے اللہ کے ضمن میں کبھی کوئی نافرمانی کیا ہو سکتی ہے۔ یہاں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب کوئی اللہ کی نافرمانی نہیں کر رہا ہے تو اس سے گناہانِ کبیرہ یعنی بڑے گناہ جس میں سب سے بڑا گناہ اور ناقابل معافی گناہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا ہے یا کسی کو قتل کرنا وغیرہ، تو یہ گناہ اللہ کو ماننے والا شخص کبھی کرے گا ہی نہیں۔ چنانچہ گناہانِ کبیرہ کے بعد چھوٹے چھوٹے گناہ اصل میں گناہ نہیں یا تو انسان کی بھول چوک والی غلطیاں ہوتی ہیں یا پھر سچائی کو پانے کے لیے نئے نئے تجربات جن کے بارے میں غالب کہہ رہا ہے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بغور دیکھا جائے تو گناہ اور ثواب کا مسئلہ غالب کے ذوقِ الٰہیات کا سب سے بڑا جرأت آزما مسئلہ ہے جس کی عقدہ کشائی وہ یعنی غالب آزاد خیالی اور روشن ضمیری کے نرم و نازک اور شفیق ہاتھوں کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ دراصل اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نافرمانی بعید از قیاس ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کے عمل کو اس قدر بلندی پر لے جانا قطعی طور پر کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ چند اور اشعار کو بھی ذوقِ الٰہیات کے ضمن میں موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً

واعظ نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دیکھیو غالب سے گر اُلجھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یا رب تیر بھی سینۂ بسمل سے پُر افشاں نکلا

(iii) اشعار میں موجود مختلف لفظیات کے نئے معانی (مصنف کی نظر میں)

یہاں کتاب میں موجود ان اشعار کی تفصیل دی جائے گی جن میں ''لفظیات'' کو نئے مفاہیم دیئے گئے ہیں اور بعض اوقات انتہائی مضحکہ خیز صورت سامنے آئی ہے کیونکہ مصنف ان لفظوں سے جو معانی اخذ کرتے ہیں دراصل وہ اپنے موضوع کے لیے ''بنائے گئے'' معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۰۶ پر اس شعر میں لفظ فضول کو نئے معانی دیئے گئے ہیں

اس لب کا مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

یہاں مصنف کا خیال ہے کہ عربی کے لفظ فضل سے یہ ''فضول'' اخذ شدہ ہے اور فضل کے معنی ہیں باقی رہنا، زائد ہونا اور ف پر پیش کے ساتھ فضول مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت فضل کرنے والا۔ اس طرح شوقِ فضول کے معنی ہوئے ایسا شوق جو آپ پر بہت فضل کرنے والا ہو۔ ایسا شوق جس میں باقی

رکھنے کی باقی رہنے کی بے انتہا طاقت و توانائی ہو اور مصنف کا خیال ہے کہ اس طرح کا شوق کسی کو ذوقِ الٰہیات کے بغیر کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ خیال گھیر کر لایا گیا ہے اسی لیے اس میں منطق بھی موجود نہیں اور تاثیر بھی ایسی نہیں کہ بات دل کو چھو جائے۔ دراصل غالب جب اس شعر کے پہلے مصرعے میں ''لب'' اور ''بوسہ'' کا ذکر کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں مخاطب محبوب مجازی ہی ہے اور اپنی اس لفظی تاویل کی بنا پر مشکور صاحب غالب کے مستند شارحین سے نہ صرف اختلاف کرتے ہیں بلکہ انہیں سخت تنقید کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ صفحہ ۶۵ پر اس شعر کی لفظیات پر زور دے کر ذوقِ الٰہیات کا پہلو نمایاں کیا گیا ہے جو درست معلوم ہوتا ہے

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا گویا سنی نہیں ابھی آوازِ صور کی

''حشر'' اور ''صور'' تو نمایاں لفظ ہیں اور صاف معنی دے رہے ہیں۔ قاتل سے مراد محبوب قتل کے مادہ سے ایک فعل ''تقتل'' بھی بنتا ہے جس کے معنی مٹک مٹک کر چلنے کے ہیں، محبوب کی یہ ادا عاشقوں کے قتل کا باعث ہے، باقی مطلب صاف واضح ہے۔ نیا مطلب یہ اخذ کیا گیا ہے کہ ہر انسان معشوقانہ انداز میں اپنی انا سے دوسرے شخص کو قتل کرنے کی ہوس میں مبتلا رہتا ہے۔ صفحہ ۱۵۱ پر اس شعر کی لفظیات پر غور کیا گیا ہے

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

اس شعر میں ہندی کے ایک لفظ ''اچھا'' سے غالب نے اس قدر فائدہ اُٹھایا ہے جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ اچھا یا اچھائی دراصل مجموعہ ہے انسان کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال کا۔ غالب کہنا چاہتے ہیں کہ اچھوں کی خواہش میں مصروف ہو کر آدمی دنیا کی معمولی معمولی ترغیبات سے بے نیاز ہو جاتا ہے گویا اچھوں کو آپ جتنا چاہتے چلے جاتے ہیں آپ دنیا کی روزمرہ کی ترغیبات سے بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مشکور حسین یاد نے ایک عمدہ کوشش کے تحت ایک ہی موضوع پر ان اشعار کو جمع کرنے کی روایت کو تازہ کیا ہے۔ چند باتیں جو اس کتاب میں اگر نہ ہوتیں تو یہ کتاب اور بھی عمدہ ہو سکتی تھی ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ مصنف نے تعلّی سے بھی کام لیا ہے اور اپنے وضع کردہ مطالب کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ بعض جگہ ان کی وضاحت نہایت منطقی اور روشن خیالی پر مبنی رہی ہے۔ مشکور صاحب کو اس بات کا شدت سے خیال ہے کہ وہ غالب کی جو تفہیم و تشریح پیش کر رہے ہیں وہ غالب کی ہدایت کے عین مطابق ہے کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لفظ و معانی کے اس خزانے تک رسائی تو ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق ہی کرے گا اور مشکور صاحب نے بھی اس کتاب کے ذریعے جدید ذہن کی عمدہ نمائندگی کی ہے۔

☆☆☆

G.A.Nedozchiwin / ڈاکٹر شگفتہ حسین

جمالیات کیا ہے؟

معاشرے کے تاریخی ارتقاء کے دوران سماجی شعور کی متنوع صورتوں نے خود کو آدمی کی روحانی زندگی اور روحانی فعالیت کے مختلف سانچوں میں ڈھال لیا۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی مراحل سے جمالیاتی محسوسات، تجربات اور ادراکات بھی ان میں شامل ہوگئے۔ اس کے نتیجے میں، سماجی شعور کی ایک معینہ ہیئت ارتقا پذیر ہوئی جس میں انسان کے حقیقت (واقعیت) کے ساتھ جمالیاتی روابط نے خود کو مستحکم کیا، ایک سانچے میں ڈھالا اور ترقی کی منزلیں طے کیں۔ یہ ہیئت ہی آرٹ ہے۔

مذکورہ جمالیاتی عناصر صرف آرٹ تک محدود نہیں ہیں اگرچہ وہ اپنا بھرپور اور جامع ترین اظہار اسی میں پاتے ہیں۔ انسان حقیقت کے ساتھ ساتھ، فطرت اور معاشرے کے ساتھ بھی جمالیاتی روابط رکھتا ہے۔ جمالیاتی تجربات صرف آرٹ کے نمونوں سے متصادم ہوکر ہی اپنا اظہار نہیں پاتے بلکہ فطرت اور سماجی زندگی کی اشیاء، مظاہر اور واقعات کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ اتصال کے نتیجے میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ جمالیات کا کام ہے کہ وہ انسان اور حقیقی دنیا کے درمیان ان جمالیاتی روابط کی باضابطگی اور باقاعدگی کے بارے میں تحقیق کرے۔ مزید براں، جمالیات کی سائنس کو معاشرے میں جاری ان روابط کے بارے میں مزید تحقیق کرنی چاہیے جو جمالیاتی مظاہر کی تمام صورتوں اور معینہ حلقۂ اثر مثلاً جیسے آرٹ کا حلقۂ اثر ہے، کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر آرٹ سماجی فعالیت کی دوسری صورتوں -- مادی پیداوار کے عمل، سیاست، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات وغیرہ وغیرہ کے ساتھ بہت قریبی بندھن باندھے ہوئے ہے اور کبھی کبھی تو اس کا کلی میلان انہی کی طرف ہوتا ہے، تاہم پھر بھی یہ اپنی معروضی خصوصیات اور اصولوں کو بھی قائم رکھتا ہے۔

یہ سب کا سب اس کُرے سے، یا جیسا کہ کہا گیا ہے، اس خاص دستور العمل کے ''معروض'' سے متعلق ہے، جسے جمالیات کہا جاتا ہے۔

جمالیات ایک سائنسی دستور العمل ہے جو آدمی کے حقیقت کے ساتھ جمالیاتی روابط کے ارتقاء کے عمومی اُصولوں اور خصوصاً آرٹ بحیثیت سماجی شعور کی ایک معینہ صورت کے بارے میں تحقیق کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں: جمالیات انسان کے حقیقت کے ساتھ جمالیاتی روابط کی عمومی اور ان کی اعلیٰ ترین صورت، آرٹ، کی خصوصی جانچ کرتی ہے۔

جمالیات سائنس کی کس قسم سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا اس سے متعلقہ اور قریب ترین دوسری سائنسوں سے کیا تعلق ہے؟

اگرچہ، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، کہ جمالیاتی محسوسات اور تجربات اکثر قطعی مختلف معروضوں اور فطری مظہر کے بطور پیدا ہوتے ہیں اور ان معروضوں اور مظہر کی فطری صفاتِ مشترک سے متصف ہوتے ہیں لیکن جمالیات کو طبیعی سائنسوں کے ساتھ خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔ جمالیاتی فعالیت اور جمالیاتی روابط انسان سے مخصوص ہیں۔ یہ معاشرے کے تاریخی ارتقاء کے عمل سے ظہور میں آتے ہیں۔ اس اعتبار سے جمالیات ایک طبیعی سائنس ہے۔ یہ سائنسوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتی ہے جنہیں Friedrich Engels "Anti Duhring" میں تاریخی سائنسیں قرار دیتا ہے اور جو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں کیونکہ یہ انسان کے رہن سہن، اس کے سماجی روابط، قانون اور ریاست کی ظاہری صورتوں، فلسفہ، مذہب، آرٹ وغیرہ کی اعلیٰ ترین ساختیت کے بارے میں تحقیق کرتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخی ترقی اور ان کی موجودہ حالت کی بھی جانچ کرتی ہیں۔

اور یقیناً جمالیات اور دوسری سوشل سائنسوں کے درمیان ایک ربط ہے اور ان سب سے بڑھ کر فلسفہ کے ساتھ۔ جمالیات ایک فلسفیانہ دستور العمل کا نام ہے۔ یہ فلسفہ کی حدود میں رہتے ہوئے ایک سائنس کی حیثیت سے اپنا ورود کرتی ہے۔ یہاں تک کہ تاریخی جمالیات اور تاریخِ فلسفہ کے درمیان بھی ایک ربط موجود ہے۔ سائنسی جمالیات مارکسٹ-لیننسٹ (Marxist-Leninist) فلسفہ سے بندھی ہوئی ہے، یہ فلسفے کے اصولوں کے سہارے خود کو قائم کرتی ہے اور اس کے طریقِ استدلال سے رہنمائی پاتی ہے، خصوصاً دو پہلوؤں کے اعتبار سے۔

ان میں پہلا ہے ___ علم علمیات (علم انسانی کے ذرائع اور مواد کا علم) کا پہلو: نظریہ ادراکِ مادی جدلیات جمالیات کی اساس ہے۔

مذکورہ بالا معنوں میں، فلسفہ کا اہم ترین سوال، موجود اور فکر کے درمیان تعلق کا سوال ہے۔ حقیقت سے جمالیات کے تعلق کے مسئلے کے حل کے لیے مارکسی جمالیات خود کو اجازت دیتی ہے کہ وہ مارکسزم-لیننزم کے مرکزی فلسفیانہ اصولوں سے رہنمائی حاصل کرے، ان اصولوں سے جو شے موجود کے اولین کردار اور شعور کے ثانوی کردار سے اور معروضی حقیقت اور مسلمہ رواجوں کے ساتھ نامیاتی ربط کی معروضی سوچ کے درمیان ادراکی تفاعل سے سروکار رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مارکسٹ-لیننسٹ جمالیات جو جمالیاتی شعور کے جوہر کو ظاہر کرتی ہے، وہ پہلے ہی Leninist Theory of Anti Thesis کو فرض کر لیتی ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاشرے کا تصور مادیت اور اس کی تاریخ، جمالیات کی بنیاد ہے۔ کوئی بھی شخص جمالیاتی شعور کی ابتداء اور ارتقاء کے مسائل کو عموماً اور آرٹ کے ان مسائل کو خصوصاً حل نہیں کر سکتا یا آرٹ کے تاریخی ارتقاء کے زیریں مخفی اصولوں کو تیقن کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا جب تک وہ تاریخی ارتقاء کے نظریہ مادیت یا تاریخی مادیت پرستی سے تعلق قائم نہ کر لے۔

دوسری طرح دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ جمالیات مارکسٹ-لیننسٹ فلسفے کے ساتھ ایک نامیاتی تعلق میں زندہ رہتی ہے، اِسی لیے اس کا ثمر ورارتقاء ممکن ہے۔ دوسری طرف کسی کو بھی جمالیات کے بارے میں یہ قیاس نہیں کرنا چاہیے کہ جمالیات ایسی سائنس ہے جو عمومی طور پر صرف فلسفے کے قائم کردہ رہنما اصولوں کی ہی توضیح کرتی ہے۔ حالانکہ وہ تمام قوانین جو عام طور پر سماجی شعور کی رہبری کرتے ہیں واضح طور پر جمالیاتی شعور کے کرّے پر بھی پورے پورے فعال ہیں۔ لیکن جمالیاتی شعور کی اپنی خصوصیت ہے؛ اس کا اپنا معینہ کردار ہے؛ اور جو واضح طور پر یہ ہے کہ جمالیات کو دریافت بھی کرنا ہے اور تحقیق بھی کرنا ہے۔ پھر اسی کرّے کے اندر رہتے ہوئے عمومی قواعد کسی ایک معینہ پہلو پر عمل کرتے ہیں۔ جمالیاتی تشریح و توضیح کو صرف عام فلسفیانہ ضابطہ رہنمائی یا قوانین تک محدود کرنا اور جمالیات کے متن قانون میں سے مثالیں چن کر ان کی توضیح کرنا اصولی طور پر غلط ہے؛ ایسے معاملے میں پھر جس مواد کا تجزیہ کرنا مقصود ہوگا -- خصوصاً آرٹ میں -- اس کی گہرائی اور لطافت اور اس کی ساری پیچیدگی سب ختم ہو جائے گا۔

کسی بھی دوسری سائنس کی طرح، جمالیات کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ تاریخِ نظریۂ جمالیات اور فکر، جمالیاتی سائنس کا ہی ایک نامیاتی حصہ ہے۔ جمالیاتی تصورات کے ارتقاء کا ان کے نقطہ آغاز سے لے کر ہمارے زمانے تک مطالعہ کر کے ہی واقعتاً کوئی شخص اس طریقہ کار کی پیروی کر سکتا ہے، جس میں بہت سے فلسفیانہ تہیجات و میلانات کے درمیان جنگ میں اور مادیت اور مثالیت پسندی کے درمیان جنگ میں، جمالیاتی نظریات اور ادراکات کی ترقی کے سائنسی تصورات ظہور پذیر ہوئے اور اس طرح مارکسٹ-لیننسٹ جمالیات کی ترقی کے لیے تاریخی داغ بیل پڑی۔ آرٹ کی ترقی اور ایک تاریخی عہد کی جمالیاتی فاعلیت دونوں کے لیے ہر جمالیاتی نظریہ ایک خاص حد تک تعمیمیت کا حامل ہے۔

اس کے ہر نظریہ میں ہر دوسرے طبقے کے مفادات و احتیاجات، اس کا آرٹ کا ذوق اور اس کے صناعانہ تصورات اپنا اظہار پاتے ہیں۔

تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ محنت کش طبقے نے، کہ جدید معاشرے کا سب سے زیادہ ترقی پسند طبقہ ہے، بورژوا طبقے کے خلاف اور ناجائز فائدہ اُٹھانے والے طبقے کے کلچر کے خلاف جنگ میں اپنا پرولتاری کلچر تخلیق کیا ہے جس کا اعلیٰ ترین اظہار مارکسزم-لینزم ہے۔

محنت کش طبقہ اور مزدوروں کی ایک کثیر تعداد کی صناعانہ تخلیقیت نے محنت کرنے والوں اور اس کلچر کے ترقی پسند تخلیق کاروں کی صفوں سے اُبھرنے والے ان ادیبوں، شاعروں اور مصوروں کی، جنہوں نے خود کو محنت کش طبقے اور لوگوں کے لیے وقف کر دیا ہے، تخلیقات میں اپنی ذات کے اظہار کو موجود پایا۔

مارکسزم جو محنت کش طبقہ کے مفادات کا ایک سائنسی اظہار اور بورژوا طوقِ غلامی کے ہر ردِعمل، ہر دفاع کے خلاف پوری دنیا کا متحد و واضح نقطۂ نظر ہے، مجموعی طور پر سماجی سائنسوں کے لیے اور

اسی طرح جمالیات کے لیے بھی ایک انقلابی موڑ تھا۔ عینیت پسند جمالیات کا اقتدار اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ اب اس کی حریف ایک ایسی جمالیات ہے جو مارکسٹ-لیننسٹ عالمگیر نقطۂ نظر کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور جو محنت کش طبقہ اور عام لوگوں کے مفادات، احتیاجات اور ضاعانہ ذوق کو سلیقہ اظہار عطا کرتی ہے۔ یوں پہلی مرتبہ ایک ایسی جمالیات منصۂ شہود پر آئی جو تمام ایسی حدود سے آزاد تھی جنہوں نے ابتدائی نظریات حتیٰ کہ ترقی پسند نظریات کو بھی مبتلائے اذیت کیا۔

مارکسٹ-لیننسٹ جمالیات، جمالیاتی فکر کی تاریخی ترقی میں ایک نیا، اعلیٰ قدم ہے۔ تنقیدی تخصیص اور ہر چیز کی دوبارہ کام کرنے کی تخلیقی قوت نے، جسے جمالیات نے مارکسسٹ-لیننسٹ جمالیات سے پہلے ہی مکمل کر دیا تھا، مارکسٹ-لیننسٹ جمالیات کو مستنبط ہونے، اپنا اظہار کرنے اور اُبھرنے میں مدد دی؛ یہ ایک سائنسی تعمیمیت ہے جو نوعِ انسانی کی صناعانہ ترقی اور سوشلسٹ آرٹ کی ترقی سے حاصل ہونے والے سیر حاصل تجربات پر اساس کرتی ہے۔

مارکسسٹ-لیننسٹ جمالیات جو کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد کے مفادات احتیاجات اور جمالیاتی تصورات کا سائنسی اظہار ہے، سوشلسٹ اور سارے ترقی پسند آرٹ کی ترقی کی تائید کرتی ہے۔ یہ جمالیات ترقی پسندانہ سماجی اور جمالیاتی نظریات کے ذریعے ہمارے آرٹ اور آرٹ کے نظریہ اور تنقید میں اضافہ کرتی ہے اور مزید ترقی پسندانہ ارتقاء کے لیے انہیں تناظر عطا کرتی ہے۔

روسی جمالیات ایک Partisan سائنس ہے۔ یہ ترقی پسند فن کاروں کے مسلمہ دستور کو تعمیمیت بخشتی اور صناعانہ تخلیق سے وابستہ لوگوں کی آرزوؤں کو باضابطہ بناتی ہے؛ یہ آرٹ کی اقلیم میں کیمونسٹ پارٹی کی سیاست کی مداخلت، رجعت پسندانہ بورژوائی، آئیڈیالوجی، ہیئت پسندی (Formalism) اور فطرت پسندی (Naturalism) کے خلاف اور سوشلسٹ ریلزم کے مسلسل نمو پذیر ہونے کی حمایت میں جنگ کرتی ہے۔ مارکسسٹ-لیننسٹ جمالیات اور سیاست کے درمیان پائے جانے والے نامیاتی رابطے کی بنیاد اس میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

جمالیات کی سائنس کے معروض اور مقاصد کی یہ فکر جدید رجعت پسند بورژوا خیالات کی مخالفت پر قائم ہوتی ہے۔ کچھ ایسے جدید نوتھامسٹ جمالیات پسند جیسے Jacques Maritain نے اس پر دوبارہ کام کیا ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ، کہ دوبارہ محنت کی ____ کہ آرٹ میں ارسطو کے حقیقت کی نقل کے نظریئے کو ازمنہ وسطیٰ کے علم الکلام کی روشنی میں پیش کیا جائے تاکہ بدذوقی اور زوال پذیر آرٹ کی غیر فطری کوششوں کو پروان چڑھایا جائے۔ ان کے لیے جمالیات کا معروض انسانی جذبات ہیں جو ماورا سے اتصال کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے معروضی ضابطوں سے فنکار کی مکمل آزادی کی منادی دیتے ہیں؛ وہ بے اصولی، موضوعیت اور رواج و دستور کی انتہائی پابندی کو فروغ دیتے ہیں اور اس امر کو قائم رکھتے ہیں کہ یہ آزادی ایک فعال روح کی غیر مرئی روحانی شعاعوں لیکن اشیاء میں نہ دکھائی دینے والی دریافت

کی طرف لے کر جائے۔

کیتھولک وجودی گیبریل مارسل سمجھتا ہے کہ جمالیات سے مراد غیر منطقی طریقوں کی مدد سے زندگی کے ''بھید'' کی تہہ میں اُترنے کی کوشش ہے۔ اِسی طرح مارسل ہمیں یہ بھی یقین دلاتا ہے کہ آرٹ سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بنا سوچے سمجھے اسے اپنے تصرف میں لے آئے۔

نظریہ عملیت کے پیروکاروں (جان ڈیوئی اور دوسرے) کے نزدیک جمالیات کا کام یہ ہے کہ وہ ایک یقینی صورتِ حال کے نقطۂ نظر سے ان اصولوں کی جانچ کرے جو ایک خاص اصطلاح کے تحت سندرتا کو ترکیب دیتے ہیں۔ جمالیات کے ایسے تصور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو خوبصورت ہے وہ اپنی معروضی اہمیت کھو دیتا ہے اور آرٹ میں موضوعیت طاقت پکڑتی ہے۔ اس قسم کے عینیت پسند نظریات اس کوشش پر مشتمل ہوتے ہیں کہ معروض کی دنیا کو انسانی تصورات میں تحلیل کر دیا جائے اور موضوعیت اور دستور کی پابندی کو صحیح ثابت کیا جائے۔

جمالیات اور آرٹ کی سائنس کے درمیان کیا تعلق ہے؟ جمالیات انسان اور واقعیت اور آرٹ کی ترقی کے درمیان جمالیاتی روابط کے عمومی اصولوں کے بارے میں تحقیق کرتی ہے؟ گویا یہ سوال درست طریقے سے یوں پڑھا جائے گا: بحیثیت ایک سائنس کے جمالیات اور آرٹ کی سائنسوں کے مختلف شعبوں کے درمیان کیا تعلق پایا جاتا ہے؟

آرٹ کی سائنس خود کو انفرادی سائنسی شعبوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ان شعبوں کے ذریعے وافر مقدار میں اکٹھا ہونے والا مواد اپنے محقق سے کم و بیش واضح تخصیص کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ تخصیص اصولی طور پر آرٹ کے مختلف اندازوں (جن میں سے ہر ایک اپنی مخصوص خوبیاں رکھتا ہے) کے مطابق ہوتی ہے جو اس خاص تحقیق کی وجہ جواز بنتے ہیں۔

نظریہ ادب، ڈرامہ، محدود معنی میں لفظ آرٹ کو برتتے ہوئے نظریہ آرٹ (اکثر اس اصطلاح سے پلاسٹک آرٹس مثلاً جیسے مصوری، مجسمہ سازی، آرکیٹکچر اور کوئی بھی اس سے متعلقہ آرٹ مراد لیا جاتا ہے) فلم موسیقی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر سائنس اپنے انفرادی طرزِ فن کی ٹھوس جامد تاریخ کے بارے میں تحقیق کرتی ہے اور عین اسی لمحے نظریاتی سوالوں خصوصاً اس سے متعلقہ سوالوں کی بھی جانچ پرکھ کرتی ہے۔

اگر آرٹ انسانی معاشرے کی جمالیاتی فاعلیت کی اعلیٰ ترین اور معینہ ہیئت ہے تو تب بھی جمالیات زندہ نہیں رہ سکتی یا منفعت کے ساتھ نمو نہیں پا سکتی، جب تک وہ آرٹ کے انداز کی ترقی کے ساتھ ساتھ آرٹ کی تاریخ اور آرٹسٹ کی عملی فاعلیت کے مطالعے کے دوران اکٹھے کیے گئے تحقیق شدہ مواد کی طرف نہ لوٹے۔

اس تعلق کے بغیر جمالیات کے مجرد نظریات اور منطقی تاویلات میں کھو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔
دوسری طرف آرٹ کی تاریخی تحقیق بھی بے سوچے سمجھے نہیں ہو سکتی ہے۔ آرٹ کے محقق کو

ٹھوس مواد کے تجزیئے کے لیے مقررہ نظریاتی اصولوں پر بھروسہ کرنا لازم ہے۔ اس طریقے سے، آرٹ کی ایک مخصوص سائنس نہ صرف جمالیات کے لیے مواد فراہم کرتی ہے بلکہ، خود بھی اس سے اپنے مطلوبہ قبل از قبل نظریاتی قیاسات وصول کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، آرٹ کے نظریئے (جمالیات) کے بغیر آرٹ کی کوئی تاریخ نہیں ہے اور آرٹ کی تاریخ کے بغیر کوئی نظریہ آرٹ نہیں ہے۔

جمالیات صرف آرٹ کی تاریخ سے ہی منسلک نہیں ہے۔ یہ ثقافت کی تاریخ سے بھی وابستہ ہے اور عمومی طور پر ان سائنسوں کی تاریخ سے جو نظریاتی مسائل کو مدِ نظر رکھتی ہیں اور سماجی شعور کی دیگر ہیتوں کی تاریخ سے--اخلاقیات اور اس کی تاریخ سے--اور مذہب اور دہریت کی تاریخ سے بھی وابستہ ہے۔ جمالیات اور نفسیات کے درمیان بھی تعلق پایا جاتا ہے، ان میں موخر الذکر انسان کی سائیکی کے اصولوں اور ہیتوں کو اور سائیکی کی ارتقاء پذیری کو زیرِ مطالعہ لاتی ہے۔ علم التعلیم اور معلمانہ سرگرمی کے سیاق وسباق میں رہتے ہوئے جمالیاتی تعلیم کے استفسارات ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ جمالیات ٹھوس مواد اور دوسری سائنسوں کے حاصل کردہ نتائج دونوں پر استادہ ہوتی ہے۔ بدلے میں یہ دوسری سائنسوں کے کام آتی ہے اس طرح کہ یہ اپنے سوالوں اور اپنے نتائج کے ذریعے انہیں وہ مواد فراہم کرتی ہے جو دوسری سائنسوں کے لیے ضروری ہے یا اہم ہے۔

یہ بات خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے کہ جمالیات اور اخلاقیات کے درمیان تعلق پر زور دیا جائے۔ لوگوں کو کمیونزم کی طرف متبدل کرنے کے لیے جامع تیاری کے واسطے جن امور کی ضرورت ہے ان میں ایک مکمل پختہ انسانی شخصیت کو سنوارنے اور عام لوگوں کے درمیان کمیونسٹ شعور کو پروان چڑھانے کا کام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ آرٹ تمام مجرب اور پرتاثیر ہیتوں میں سے ایک ایسی ہیئت ہے جو اس کام کو مکمل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے جہاں تک ایک انسان کو کمیونزم کی تعلیم دینے اور اس میں اس شعور کو پروان چڑھانے کا تعلق ہے تو یہاں جمالیات اور اخلاقیات (نظریہ اخلاق) کے استفسارات خصوصاً قریبی وابستگی رکھتے ہیں۔ ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ جمالیات نہ صرف کمیونسٹ تعلیم کے دستور کو قابلِ عمل بناتی ہے بلکہ یہ خود بھی اس تعلیم کا ایک ذریعہ ہے، کیونکہ یہ لوگوں کے جمالیاتی تصورات کو ایک باضابطہ شکل دیتی ہے اور آرٹ کے بنیادی مسائل کو سمجھنے میں عام لوگوں کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات (۱۴)

ادب اور معروضی حقیقت

ممتاز طہر۔۔نئی سمتوں کا سفر

ممتاز اطہر کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ رائے با آسانی قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ ہر لمحہ نیا کرنے اور نیا ہونے کی جستجو کرتا رہتا ہے۔خود کو نیا کرنے کا یہ جتن وہ گزشتہ تیس پینتیس برسوں سے کر رہا ہے۔اس کا شعری سفر اور اس سفر کی یادگار (دو مجموعہ ہائے کلام اور بعد کی شاعری) اس کے نئے ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ شاعر اپنے پہلے مجموعہ کو ساری عمر دہراتے رہتے ہیں اور اس کی چھاپ اس قدر گہری ہوتی ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے دامن نہیں چھڑا پاتے۔ یہ چھاپ پہلے پہل ان کی پہچان (؟) اور بعد ازاں ان کے تخلیقی بنجر پن کو واضح کرتی ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ بزرگ شعرأ کے تازہ شعری مجموعوں کے سرورق پر ان کی پینتیس، چالیس برس پرانی غزل یا نظم قاری کا منہ چڑا رہی ہوتی ہے جو قاری کو ''نہ تو روک سکتی ہے'' اور نہ ہی قاری رکتا ہے اور پھر یہ حادثہ شاعر کے لئے نہ بھولنے والا سانحہ بن جاتا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ ممتاز اطہر نے شعری سفر میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ورنہ وہ بھی پتھر کا ہو چکا ہوتا۔ممتاز اطہر کو بھی ان معدودے چند شعرأ میں شمار کیا جا سکتا ہے جو ہر لمحہ نئے ہونے کے آرزومند ہوتے ہیں۔

غزل ممتاز اطہر کی شاعری کا بنیادی تخلیقی حوالہ رہی ہے (اور ہے بھی) اس کا پہلا شعری مجموعہ کلام ''محبس میں دراڑ'' ۱۹۹۲ء (دوسرا ایڈیشن: ۱۹۹۷ء) میں جبکہ دوسرا مجموعہ ''اِک اور منظر'' ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔یہ بات دوست ہے کہ یہ دونوں کتابیں غزل کی شکل میں ہیئت بند ہوئی تھیں مگر موضوعات اور اسالیب کے حوالے سے دونوں کا مزاج اور دونوں کی بو باس بالکل مختلف ہے۔''محبس میں دراڑ'' کا شاعر طویل مارشل لائی دور کی تلخی اور تاریکی کے خلاف مزاحمت کرتا ہے جبکہ ''اک اور منظر'' کا شاعر اس مزاحمتی منطقے سے الگ نئے منطقوں کی تلاش کا شاعر دکھائی دیتا ہے۔''محبس میں دراڑ'' کے برعکس یہاں استعارات اور علامات کی سطح گہری اور معنی خیز ہے۔ یہاں معروض کی ٹھوس حقیقت اور تلخی تحلیل ہو کر دھندلے خاکوں اور کیفیات میں تبدیل ہو گئی ہے۔اس کتاب کی لفظیات بھی ٹھوس حقائق کی بجائے سیال کیفیات کی نمائندہ ہیں۔ یاد رہے کہ پہلے اور دوسرے مجموعہ کلام میں تقریباً گیارہ سالوں کا وقفہ ہے۔اس کے بعد ممتاز کے یہاں ایک رویہ ہیئت میں تبدیلی کا بھی ہے۔اس عرصہ کی یادگار ایک شعری تجربہ ہے جسے اس نے ''ست روپی'' کا نام دیا ہے۔میرے خیال میں اس ہیئتی تجربے کو اس نے اپنے مزاج کی تبدیلی کا ذریعہ بنایا ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ نظم کی طرف آیا ہے۔ایک غزل گو شاعر، جو ہیئت کی پابندی کا قائل ہے، کا نظم اور وہ بھی آزاد اور نثری نظم کی طرف آنا قابل غور عمل ہے۔غزل کے پر سوز صحرا سے نظم کی پر شور اور پیچیدہ گھاٹیوں تک آنا ایک شاعر کی قلب ماہیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تبدیلی کیسے اور کیونکر ہوئی یہ الگ بحث ہے البتہ اس کے اثرات خاصے خوش گوار دیکھنے میں آ رہے ہیں۔سر دست ممتاز اطہر کی کچھ نظمیں قارئین کی نذر کی جا رہی ہیں۔(مرتب)

الگنی پر لٹکے ہوئے خواب

اُدھر
شاخچوں اور ہواؤں میں گرہیں پڑی ہیں
کوئی ان کو کھولے،
تو اِن میں تمہارے ہمارے زمانوں کا ریشم
پڑا سو رہا ہے
کہیں سے کھلا، اور کہیں اُلجھا اُلجھا
کہیں اس میں وعدے کی ڈوری بندھی ہے
کہیں اس کی اُلجھی ہوئی گچھیوں میں
نئی شاخ کے پھول رکھے ہوئے ہیں
کہیں اِس میں چھپتی ہوئی
تتلیوں کے پروں سے بچھڑتا ہوا
رنگ پھیلا ہوا ہے
کہیں اس میں اِک نقرئی سی ندی بہہ رہی ہے
کوئی ایک بجرا بہت دھیرے دھیرے
چلا جا رہا ہے
اِدھر، الگنی پر
تمہارے ہمارے سبھی خواب
لٹکے ہوئے ہیں
لہو میں بھگوئے گئے ان کے ملبوس
اب دھجیاں ہو چکے ہیں
تجھے یاد ہوگا، کہیں دور تک
اور بہت دیر تک
کالی مٹی پہ ان کو گھسیٹا گیا تھا
ترے خواب کے ہونٹ کاٹے گئے تھے
مرے خواب کی نم زدہ، زرد آنکھوں میں
جلتی سلاخیں بجھائی گئی تھیں
مگر مدتوں بعد بھی میں
ترے خواب کی گفتگو سن رہا ہوں
ترے خواب کے سرخ پھولوں کو
اور تتلیوں کے پروں کو
زمانوں کے ریشم کی اُلجھی ہوئی گچھیوں کو
ابھی تک
ان آنکھوں میں محفوظ رکھے ہوئے ہوں

گمشدہ سمتوں کی دھند میں

بہت دن جی لیا ہے
کسی ضوریز ہالے سے نکل کر
مگر اک آنچ سی میرے لہو میں
اب بھی جیسے، جی رہی ہے کروٹیں لیتی ہوئی
اور بستر پر
ابھی تک سلوٹیں
روشن لکیروں کی طرح ابھری ہوئی ہیں
مری مٹھی میں کوئی راکھ ہے، بجھتے زمانوں کی
اور اس میں یاد جیسی کوئی چنگاری چمکتی ہے
مگر میں اپنی مٹھی
کھولنے کا رسک شاید لے نہیں سکتا

بہت دن جی لیا ہے
راکھ کے دریا میں بہتے
ستاروں، جگنوؤں اور تتلیوں سے تمہاری داستاں کہتے
تمہارے ہجر کے قصے سناتے
تمہاری جلوتوں میں آئینہ رکھتے
تمہارے خال و خد سے لمس لیتے
اور اپنی خاک کو آنکھوں سے نم کرتے

بہت دن جی لیا ہے
کسی چوکور منظر کی مسافت میں
جہاں گوندھی ہوئی مٹی
ہوا سے بات کرنا چاہتی ہے
جہاں اک آگ پانی ہو رہی ہے
کسی بھی سمت سے
میں تین سمتیں دیکھ سکتا ہوں
میں چوتھی سمت ہوں
اور اپنی گمشدہ سمتوں کی گہری دھند
چھٹنے کی طلب میں جی رہا ہوں
مگر وہ کون ہے، جو
اب بھی میرے چار سُو
بس دائرے ہی دائرے تخلیق کرتا ہے

عجب طلسمِ ذات و کائنات ہے

عجب طلسمِ ذات و کائنات ہے
خمار سا بھرا ہوا ہے چار سُو
پیالہ سا دھرا ہوا ہے آسماں کے روبرو
اور اس کے لب سے چھو رہے ہیں ماہتاب
چھلک رہی ہیں شاخچوں سے کونپلیں، نئی نئی
اتر رہے رہیں، چومنے کو آفتاب

دِشائیں ہیں، اور ان میں کہکشائیں ہیں
اور اک طرف کو ریگِ سرخ ہے بچھی ہوئی
سمے کے زرد پاؤں سے نشاں ہیں کچھ بنے ہوئے
اور ان سے دور خاک پر مکان ہیں
وہ جن میں ایک عمر سے کوئی بھی رہ نہیں رہا
مگر یہ کیسا شور ہے
اور اس میں کیسے گیت کی ہے لَے چھڑی ہوئی؟

عجب طلسمِ ذات و کائنات ہے
الاؤ ہے جلا ہوا
اور اس کے گرد اک طویل رات ہے
رات کے بطون سے ابھر رہی ہے داستاں
کسی نئے جہان کی

مرے اندر کے اندر

مرے اندر کے اندر، کون ہے جانے
کبھی وہ گنگناتا ہے، تو لگتا ہے
ازل کی سمفنی کے سُر چھڑے ہیں
زمانے چلتے چلتے، رقص کرنے لگ گئے ہیں
اور سیاّروں کو گردش مل رہی ہے
ہوا مخمور سی ہے
اور خوشبو لڑکھڑاتی پھر رہی ہے
مرے اندر کے اندر، کون ہے جانے
کبھی وہ کھلکھلاتا ہے
تو پھول اس کی ہنسی کا لمس لینے کو تڑپتے ہیں،
پرندے زندگی کے شاخچوں پر جھولتے ہیں
کبھی وہ دُکھ کی اجرک اوڑھتا ہے
سسکیاں لے لے کے روتا ہے
تو اندر دیر تک، بوندیں برستی ہیں
کیارے بھرنے لگتے ہیں
ندی نالے کناروں سے چھلکتے ہیں
بہت ہی دور تک
آہستہ آہستہ، سمندر پھیل جاتا ہے
اُداسی اس پہ اپنے پنکھ پھیلائے
زمانوں کے کنارے ناپتی ہے
مرے اندر کے اندر،
کہیں شہتوت کا جنگل اُگا ہے
بہت ریشم بنایا جا رہا ہے

میرے چاروں طرف
گولہ سا اک تخلیق ہوتا ہے
اور ایسے میں
دبے پاؤں، میرے نزدیک آ کر
مرے ریشم کی ساری ڈوریوں کو کھول دیتا ہے
میرے اندر کے اندر۔

لفظ کی اوٹ سے

کہیں بھی رکھ دیتا ہوں
کسی خواب کی قاش
کسی پرندے کا گھونسلہ
اور ہواؤں کی گٹھڑی
اور بھول جاتا ہوں
پھر کسی خواب سے کوئی خواب نہیں جڑ پاتا
کوئی رخنہ سا رہ جاتا ہے

کہیں بھی رکھ دیتا ہوں
نئی شاخ کا پھول
بجھا ہوا چراغ
اور اپنی آنکھیں
اور بھول جاتا ہوں
پھر کوئی منظر کسی منظر میں نہیں ملتا
دھواں سا بھر جاتا ہے

کہیں بھی رکھ دیتا ہوں
کسی خواہش کی آنچ
تلاش کے پاؤں
اور نظم کا ایک ٹکڑا
اور بھول جاتا ہوں

مگر مجھے یاد رہتا ہے
شام کے دھندلکے میں ایک درخت
اور اس کی شاخوں سے
جھانکتا ہوا کانچ کا اِک چاند
اور وہ لفظ
جو تو نے اپنے ہونٹوں سے
میرے ہونٹوں میں رکھا تھا۔

مسمار ہوتے عہد میں

ہم نہیں دیکھتے
اِن دنوں آسماں کی طرف
بادلوں، پنچھیوں اور ستاروں میں
شاید کوئی بھی نہیں
بارشیں خشک مٹی سے روٹھی ہوئی
پنچھیوں کے سبھی گیت
بے صوت حرفوں میں بکھرے ہوئے
آسماں کی طرف سے
برستی ہوئی آگ میں
کوئی پہلے سا منظر نہیں ہے
دھوئیں کے سوا، کچھ دکھائی نہیں دے رہا

اپنے سیّارے پر ان دنوں
آگ کا راج ہے، موت کا کھیل ہے
اور مسمار ہوتے ہوئے عہد میں
کس طرف کون موجود ہے،
کس کو معلوم ہے؟

راستوں اور دلوں پر کسی خوف کی چاپ
نقشہ بدلتی ہوئی ساعتوں کو
جنم دے رہی ہے

نہیں دیکھتے، ان دنوں آسماں کی طرف
ان دنوں میں
ستاروں کی چالیں سمجھنے کی فرصت کسے؟
ان دنوں
ہم کو مٹی سے کٹنے کا دھڑکا بہت ہے

مٹی میں اک پل کا تماشا

دنیا سپنوں کی ڈھیری ہے
یہ جیون جو ہمیں ملا ہے، بس اک پل ہے
اور ہمیں اک پل کے اندر
اک سپنے کو
اپنی آنکھیں دینی ہیں
سپنوں کی ڈھیری میں ____ دنیا
خود کو پائے بس اک پل کو

شاید تو نے ٹھیک کہا ہو
ممکن ہے یہ بات بھی سچ ہو
اس جیون میں ہونی اور انہونی کیا ہے؟
یہ مٹی کا کھیل تماشا
مٹی کی خاطر ہوتا ہے
شاخوں پر پھولوں کا کھلنا
جھرنے کا ندی تک جانا
تارے کا مٹی میں ملنا
اور دریا کا صحرا ہونا
سب ہونی کا حصہ ہے
لیکن تیرا، ریشم جیسے لفظوں میں یوں پُرسا دینا
میرے غم کو، کتنا کم کر سکتا ہے؟
یہ جو میں نے، شام سے پہلے دیا جلا کر
مٹی اندر رکھا ہے
کیا اک پل کو رکھا ہے؟

ایک نظم کی موت پر

نومبر، تیس دن کے درمیاں سے
دانہ دانہ ٹوٹ کر میرے کھڑنجے میں پڑا ہے
اور اس کے باقی ماندہ دن بھی
دھاگے سے نکلنے ہیں

نومبر میں، مجھے یہ شہر
نرسل کا گھنا جنگل دیکھائی دے رہا ہے
کہیں برسی ہوئی بوندوں کو چھو کر
جب ہوائیں
اِن گلی کوچوں میں آتی ہیں
تو ہر دیوار و در پر
وحشتیں تحریر کرتی ہیں
ہوائیں نم زندہ کمروں کے اندر
ہونے والی گفتگو، نرسل کی خوشبو
راستوں کو دان کرتی ہیں

ادھر میں نے گلی کے موڑ پر
اک زندگی کو
نظم کی صورت میں دیکھا ہے
جو اک بوسیدہ فرغل اوڑھ کر
بے سدھ پڑی ہے
بدن پر ذلتوں کے چیتھڑے ہیں،
درد کی گہری خراشیں ہیں
اور اس کے خوبرو چہرے پہ
دانتوں کے نشاں نیلاہٹیں پہنے ہوئے ہیں
جا بجا بکھری پڑی ہیں کاسنی ہونٹوں کی قاشیں
اور گلی کے فرش پر
اس کے لہو کا نقش مدہم ہو رہا ہے
اس کی حیرت سے بھری آنکھیں
مری آنکھوں میں
اک تصویر ہو کر رہ گئی ہیں
نومبر، تیس دن کے درمیاں سے
دانہ دانہ ٹوٹ کر میرے کھڑنجے میں پڑا ہے

مَیری کے نام

تم دیکھ سکتی ہو
محبت کے پھول پر سلگتی ہوئی شبنم
تتلی کے پروں پر لکھی ہوئی کہانی
خواب کے دریچے میں
جلا ہوا چراغ
اور پرندے کے پروں میں
دور کے سفر کی پیاس
تم دیکھ سکتی ہو

تم جھانک سکتی ہو
میرے ملبوس کے اندر
مری ذات میں
ادھ کھُلے خواب کے دریچے سے
پرانے بغداد کے در و دیوار
اور ان پر بارش سے بنی
تصویروں کے اندر
دور تک
تم جھانک سکتی ہو

تم بھیگ سکتی ہو
دجلہ کے پانی میں، مٹتی بنتی

قمقموں کی روشنی
ملاحوں کے گیت
وائن کے آخری جام
اور بدن کی خمیری خواہشوں کے درمیان
لذت کے آبشار میں
دیر تک
تم بھیگ سکتی ہو

اور تم مجھے ڈھونڈ سکتی ہو
یونیورسٹی کی لائبریری میں
کتابوں کی راکھ پر
یا پھر، گرجے میں اعترافِ گنہ کے دوران
یا، سکول سے نکل کر بے سمت بھاگتے ہوئے
بچوں کی چیخوں میں
خون میں لتھڑی جوتیوں کے درمیان
منہدم ہوتی عمارتوں کے ملبے میں
راشن کی قطاروں میں، اور جلی ہوئی بسوں میں
سڑکوں پر بکھرے بے حرکت جسموں
اور ہسپتالوں میں زخمیوں کے بیچ
درد کے ''کوریڈور'' میں
کراہتی ہوئی انسانیت کے پہلو میں
آنسو بہانے والوں کے درمیان
تم مجھے
کہیں بھی ڈھونڈ سکتی ہو

سیہ خیمے کے اندر

اک سیہ خیمے کے اندر، شام

میرے روبرو

گزرے دنوں کی موڑ کھاتی سیڑھیوں میں

طاق پر رکھے دیے کو یاد کر کے رو رہی تھی

اور صحرا

اس کی آنکھوں سے اترتی بارشوں میں بھیگتا تھا

کارواں کی دھول شاید جم چکی تھی

اور نقوشِ کارواں معدوم ہوتے جا رہے تھے

ریت پر رازوں بھری چپ

سو رہی تھی

پھر ہوا نے شام کے ماتھے کو چوما

بال چہرے سے ہٹائے

اور اُس کے گال سے بہتا نمک چکھا

کسی حرفِ تسلی سے تہی ہوتے ہوئے بھی

شام کو میں نے تسلی دی

اور اس کا ہاتھ تھامے

دُوور.....تک چلتا گیا ہوں

خواب کی گٹھڑی کو چوبِ خشک سے

کاندھے پہ لٹکائے ہوئے،

میں دُوور.....تک چلتا گیا ہوں

جس جگہ سے آ رہی تھی اِس طرف

گندم کی خوشبو

پھر سیہ خیمے کے اندر، شام

میرے روبرو ہے

خواب کی گٹھڑی کُھلی ہے

گھر کی دیواریں

مری مٹی سے لیپی جا چکی ہیں

اور ڈھلتی عمر کی سیڑھی کو طے کرتے ہوئے

رازوں بھری چپ

ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے

جس جگہ اک موڑ ہے

اک طاق سا ہے، جس کے اندر

خواب کی گٹھڑی سے نکلا،

اک دیا،

رکھنا ہے مجھ کو

آبِ گم گشتہ کی کھوج میں

☆ پدماوتی، ملتان میں صدیوں پہلے سورج دیوتا کے مندر کی ایک ایسی رقاصہ تھی جس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ روایت ہے کہ اُس کے رقص میں مندر کے بُت اور دیوتا شامل ہوتے، اور جیسے گردشِ زمانہ اُس کے ساتھ ساتھ رقصاں رہتی۔

☆ دریائے راوی، اُس زمانے میں ملتان کی مغربی سمت میں شمال سے جنوب کے رُخ بہتا ہوا موجودہ لوہاری دروازہ، بوہڑ دروازہ، بن لوہاراں اور بستی موہانیاں (ملاحوں کی بستی) کے آگے سے گزرتا تھا۔

پدماوتی،
اِے پدماوتی!
کس کھونٹ گئے ترے پاؤں؟
کہاں گئی وہ مَٹی، جس پر چھاپ تھی تیرے تلووں کی
اور تارے اُس پر اُتریں تھے
کہاں گئے وہ گھنگرو؟
جن کی چھنک چھنک، چھن چھن گرتی
بوندوں کے بھیتر
بادل سانسیں لیویں تھے
رات کے ماتھے چاند کا ٹیکہ لاگے تھا
مندر کی دیواروں اندر
اور مُہانوں * کی بستی میں
رقص رچے تھا
اندر اندر، جانے کتنے دیپ جگیں تھے
اور سارے میں لوبانوں کی لپٹیں
اندر، باہر گھومیں تھیں
مندر کی دیواروں اندر

دیوتا آ کر، تیرے تھرکتے گھنگرو چوم کے ناچیں تھے
تنک تنک تا تھیّا تھیّا

اور مرے باپو کی بیّا
ٹھُمک ٹھُمک راوی کی گود میں اُترے تھی
وہ جس کی چھاتی کے اندر
صدیوں کا اِک گیت بھرے تھا
اور پھر بارش ہووے تھی
ساری بستی بھیگے تھی
میں باپو کا چپّو
راوی کے پانی سے باتیں کرتے کرتے
جانے کیا کیا کہہ جاؤں تھا
بیّا میّا کی گودی میں سر کو رکھے
پار کے خواب میں بہہ جاؤں تھا
اپنے گریڑے ** کے باہر جو گیلی مٹی ڈھیر لگی ہے
اُس پر سورج سے کھیلوں تھا
اور اُسے اپنی بانہوں میں لے لوں تھا

پدماوتی،
اِے پدماوتی!
جانے کتنے جُگ بیتے ہیں
جانے کتنے آکاشوں نے کروٹ بدلی
مٹی پر مٹی کی کتنی پرتیں چڑھی ہوئی ہیں
تیرا رقص تھما تو جیسے
صدیوں کی نبضوں میں گرہیں پڑی ہوئی ہیں
اور حصارِ بالا سے راوی تک، لمبی خاموشی ہے

نیّا، میّا، جانے کن پاتالوں نیچے اُتری ہوئی ہے
پار کے خواب میں بہنا بھی، اب خواب ہوا ہے
اور مُہانوں کی بستی میں پیاس اُگی ہے
گیلی مٹی سُوکھ گئی ہے

پدماوتی!
لا، اُس کھونٹ سے اپنے پاؤں
آ، مَیں اِن میں تاروں کے گھنگھرو پہنا دوں
دیکھ اِدھر، اِس رات کے ماتھے لگا ہوا
مٹی کے چاند کا ٹیکہ
آج انوکھا رقص رچا دے
اور سارے میں، پھیلی ہوئی جو خاموشی ہے
اس کی راکھ اُڑا دے
میری نیّا، میرا راوی واپس کر دے
مجھ کو اُس کے پانی سے کچھ کہنا ہے
پار کے خواب میں
اور صدیوں کے گیت میں،
تھوڑی دیر کو بہنا ہے

* ملاحوں ** جھونپڑا

اجل سے مکالمہ

اجل!
ہم نے دیکھا ہے تجھ کو ''سونامی'' کی صورت
زمیں کی تہیں چیرتے، اور سمندر کی لہروں کو
سہمے ہوئے آسماں سے ملاتے
سرِ خاک بستے ہوئے
ابنِ آدم کی ہستی پہ یلغار کرتے
تجھے ہم نے دیکھا،

ترے ہاتھ کو، زندگی کے بدن پر
کروڑوں کی تعداد میں زخم لکھتے
کئی لاکھ لوگوں کو، لقمہ بنا کر نگلتے
مکانوں، نشانوں کو نابود کرتے
زمیں کی طنابیں گراتے
قیامت سے پہلے قیامت جگاتے
تجھے ہم نے جھیلا ہے خود پر،

اجل!
تو نے جل سے
جن آنکھوں کو جل تھل کیا ہے
اُن آنکھوں کو دیکھا نہیں ہے،

جو روحوں سے چیخیں اُبھر کر، فضا میں گھلی ہیں
وہ تو نے سُنی ہی نہیں ہیں
کہ تجھ کو پلٹ کر کبھی دیکھنے اور سننے کی قدرت نہیں ہے،

دسمبر کی چھبیس تاریخ سے، آسماں سوچتا ہے
''سونامی'' کی تاریخ کیسے رقم ہو؟
یہ انسان کی روح سے، پھوٹتی
چیخ
کیسے رقم ہو؟

مگر اے اجل!
تجھ سے ہم
ہارنے والے ہرگز نہیں
تو ہمیں مار سکتی ہے،
لیکن ہماری محبت امر ہے
ہم انسان،
انسانیت کی بقاء اور شرف کے لئے
سارے زخموں پہ
اپنی محبت کا مرہم رکھیں گے
فنا ہو چکی بستیاں، پھر سے آباد ہوں گی
اُداسی میں ڈوبے ہوئے
زرد جسموں کو اپنا لہو دے کے
گلنار کر دیں گے
آنکھیں جو دہشت سے بے خواب ہیں
اُن کو پھر
اپنے خوابوں کی جاگیر دیں گے
اور اُجڑے ہوئے، لاکھوں لوگوں کو ہم
اپنے حصے کی روٹی، دوائیں، دعائیں،
بحالی کے موسم
خوشی کی اُمنگیں، ترنگیں
سبھی سونپ دیں گے
اجل!
تجھ سے ہم ہارنے والے ہرگز نہیں ہیں۔

یہاں جو عصبیت کی ریت اڑتی ہے

یہاں سے جن دنوں دریا گزرتا تھا
تو ہم اس کے کنارے
نم زدہ مٹی میں پاؤں دے کے
اس پر گھر بناتے تھے
دریچے سب کھلے رکھتے
اور ان میں شام ہوتے ہی، دیے رکھتے
کہ خوابوں کے فرشتے ان میں اتریں گے
ابد کے گیت گائیں گے
ہماری کشتیاں، دریا کے بیچوں بیچ لہروں پر
مسلسل رقص کرتیں
اور ہمارے چھوٹے چھوٹے قہقہے
پانی کے اوپر جگمگاتے تھے
کناروں پر بہت سی بستیاں آباد ہوتیں
اور عجب منظر ہمارے روبرو رہتے
درختوں پر، محبت کے پرندے
دور دیسوں کی کتھائیں ساتھ میں لاتے
اور اک میلہ لگا رہتا
ہم اس میں جھومری بن کر اُترتے
اور نیلا آسماں ہم رقص ہوتا تھا

سنا ہے پھر فرشتوں کے تعاقب میں
عزازیلوں کا ٹولا
فصل بونے کے دنوں میں

بستیوں کے درمیاں اُترا
''کہ دوزخ کے شجر کا بیج اس مٹی میں بونا ہے''
سو، اب دریا کے بیچوں بیچ
پانی کی کہیں اک بوند بھی باقی نہیں ہے
اور زباں پر دوزخی کانٹے اگ آئے ہیں
دلوں میں نفرتوں کی آگ ہر منظر کو چاٹے جا رہی ہے
اب،
محبت کے پرندوں کی کتھائیں،
اور درختوں کی کھلی بانہیں،
ابد کے گیت کی خواہش،
سبھی کچھ راکھ ہونے جا رہا ہے
اور یہاں جو عصبیت کی ریت اڑتی ہے
اسی میں
ذہن اور آنکھوں کی لاشیں دفن ہونی ہیں۔

نظم ہونے سے ذرا پہلے

کبھی میرے آنگن کی بائیں طرف
نیم کا پیڑ تھا
اور دائیں میں پیپل کا بوڑھا شجر،
جن کی شاخوں کی محراب میں
شام، سورج کو لا کر
ذرا سا ٹھہرتی
تو چڑیاں بہت دیر تک شام کا گیت گاتیں
اور آنگن میں نیندوں کی پریاں اترتیں
پرانی کہانی کے کردار
خوابوں کا زینہ اتر کر مجھے آ کے ملتے
کوئی باغ ہوتا
اور اس میں کوئی شاہزادی
ذرا دیر کو کھلکھلاتی،
پھر آنکھوں سے تارے گراتی

کبھی میرے آنگن میں
رکھے گئے کینوس پر بنی ایک تصویر
رنگوں سے باہر نکل کر
بہت دور تک میرے ہمراہ چلتی
ادھر میری تختی پہ حرفوں کے پیوند

لفظوں کی تشکیل کرتے
تو اجلے پرندوں کے پَر پھڑ پھڑاتے
مرا دل دھڑکتا
کوئی لے مجھے دیر تک اپنی بانہوں میں رکھتی

مری ماں کبھی اپنے خوابوں کی مٹی سے
آنگن کو ہموار کرتی
تو مٹی کی خوشبو
مری روح میں، دھیرے دھیرے اترتی
کئی روز تک میں مہکتا

اچانک کسی شام،
نیم اور پیپل کی شاخیں، خموشی سے مجھ میں جو اتریں
تو چڑیوں کی چہکار سے بھر گیا ہوں
مرے رنگ لفظوں میں ڈھل کر
صدا ہو گئے ہیں
پرندے، بہت دور تک مجھ میں اڑنے لگے ہیں
مرا کینوس پھیل کر آسماں ہو گیا ہے

لوشون/ خالد فتح محمد

پاگل آدمی کی ڈائری
(چینی کہانی)

انور کاکا/ننگر چنا (سندھی ادب سے)

مسجد کی آنکھیں

اُس نے سوچا، ''اس مرتبہ گیارہ ستمبر کے امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہوئے دھماکوں کے سبب جمعہ کی نماز کے وقت سخت انتظامی اقدامات کیے گئے ہیں۔ قدم قدم پر پولیس اور رینجرز کے جوان کسی بھی امکانی دہشت گردی کو روکنے کے لیے چوکس و مستعد کھڑے ہیں اس لیے مجھے ڈرنا نہیں چاہیے لیکن پھر بھی خوف ہو رہا ہے۔ واقعی اپنی جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ اذانیں ہو چکی ہیں۔ ہر طرف سے آنے والی لاؤڈ سپیکروں کی آوازیں کتنا ڈرا رہی ہیں! لوگ نماز کے لیے آ تو رہے ہیں لیکن ان کے چہروں پر کتنا خوف اور ہراس چھایا ہوا ہے، جیسے کوئی انہیں نماز کے لیے نہیں بلکہ پھانسی گھاٹ پر لٹکانے کے لیے زبردستی لیے جا رہا ہو۔ ایک تو اس میڈیا نے بھی لوگوں کو پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ اخباروں اور ٹی وی چینلز پر پہلے سے خبر آ جاتی ہے کہ فلاں دن خطرناک دہشت گردی کا خطرہ ہے۔ اوپر سے کسی نہ کسی سیاست دان کا بیان بھی اسی حوالے سے جلی سرخیوں میں چھپا ہوا ہوتا ہے جو اس خبر پر تصدیق کی مہر لگا دیتا ہے اور اس جمعہ کو تو رات سے ہی تقریباً آدھے شہر سے اچانک بجلی چلی گئی۔ روشنیوں کا شہر اچانک اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اکثر موبائل فونز کے نمبر busy رہنے لگے تو ہر طرف چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ ''کوئی خطرناک واقعہ''۔ لوگوں کی چھٹی حِسیں خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھیں جب کہ لوگ صبح کو اُٹھے تو اخباروں میں ایسی کوئی خبر نہ تھی اور بجلی چلے جانے کا سبب کچھ اور نہیں پر بجلی گھر کی خرابی تھی۔ حکومت نے امکانی خطرے کے پیش نظر پولیس اور رینجرز کو ہائی الرٹ رہنے کا حکم دیا تھا۔''

پھر سوچا، ''پولیس اور رینجرز تو واقعی ہائی الرٹ ہیں اور یہ تو ہمیشہ ہائی الرٹ رہتے ہیں لیکن پھر بھی ظالمانہ کارروائی کرنے والے اپنا کام کر کے غائب ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے کام کا کوئی سراغ بھی نہیں چھوڑتے۔ شاید کوئی خلائی مخلوق ہیں ورنہ انسان تو انسانیت کو شرمانے والی ایسی ظالمانہ کارروائیاں نہیں کر سکتے۔''

اس کی سوچیں دھارے کی طرح بہتی رہیں، ''مجھے خواہ مخواہ بیچاری خلائی مخلوق کو الزام نہیں دینا چاہیے۔ ایسی بھیانک کارروائیاں صرف انسان ہی کر سکتے ہیں۔ ایٹم بم بھی تو حضرت انسان نے ہی بنایا ہے نہ کسی اور مخلوق نے۔'' بموں کے متعلق سوچتے ہی اسے پسینہ آ گیا۔ ''آج بھی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے لیکن یہ ملّا صاحب کو آخر کیا ہو گیا ہے؟ دوسروں پر اتنی شدید نکتہ چینی! اُس کی باچھوں سے رال ٹپک

رہی ہے۔ آخر یہ مولوی حضرات کب سدھریں گے؟ پتہ نہیں سدھریں گے بھی یا نہیں! انتہا پسندی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ دنیا کو تباہی کے کنارے پہنچانے والی بھی تو یہ انتہا پسندی ہے جو دراصل مختلف مذہبی ٹھیکیداروں کے دماغ کی گندی سوچ ہے۔''

اس کا دم گھٹنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ آج یہاں بھی کوئی بندہ اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر آیا ہوگا اور کچھ دیر میں ایک بڑا خودکش بم دھماکہ ہوگا۔ پھر ہر طرف بکھری ہوں گی انسانی لاشیں۔ کہیں کسی کا بازو ہوگا تو کہیں کسی کی ٹانگ۔ پھر اپنے جسموں سے علیحدہ اعضا اپنا گناہ دریافت کر رہے ہوں گے کہ ہمیں کس جرم کی سزا ملی۔ چہار اطراف خون ہی خون ہوگا، سب کا ایک جیسا خون۔ دہشت گرد کے خون کی بھی پہچان نہیں ہو سکے گی۔ اگر خون میں کوئی تحریر موجود ہوگی بھی تو کوئی اُسے پڑھ نہیں سکے گا۔

اُس کی سوچ تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ''مجھے اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ لیکن اس ملاّ کو آج کیا ہوا ہے؟ اللہ، رسول کا ذکر چھوڑ کر امریکہ کے بہانے دوسرے فرقہ والوں کے خلاف زہر اُگلے جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اور کوئی نکلے یا نہ نکلے خودکش حملہ ضرور ہوگا۔ ہوسکتا ہے بس ہونے والا ہی ہو۔ انہی لوگوں میں کوئی بھی دہشت گرد ہوسکتا ہے۔ یہ ملا بھی تو نہلے پہ دہلے ہیں، دہشت گردوں کو اُکسا رہے ہیں۔ لیکن دہشت گرد ہیں کہاں؟ یہاں سینکڑوں آدمی ہیں شاید ان میں کوئی بھی ہو۔ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ وہ جو سامنے سفید لباس میں لمبی داڑھی والا وضو کر رہا ہے، شاید وہی ہو۔ قریبی دنوں میں جتنے بھی خودکش بم دھماکے ہوئے ہیں ان میں ایسی مذہبی وضع قطع رکھنے والے لوگ ملوث تھے لیکن مجھے اس سفید لباس والے کے متعلق ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ تو کوئی نیک آدمی لگ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر کیسا نُور برس رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چہرہ موسیٰ ایسا اور دل ابلیس کا۔ ہوسکتا ہے وہ سامنے کا ٹن زیب تن کیے آنے والا ہی دہشت گرد ہو۔ اس کی آنکھوں میں رحم دلی کی کوئی رمق بھی نظر نہیں آتی۔ اس کا چلنا بھی کچھ کچھ لفنگوں ایسا ہے۔ افسوس! یہ میرے ذہن میں کیسے غلط اور خوف زدہ کرنے والے خیالات آ رہے ہیں۔ اس بیچارے کے ساتھ تو ایک بہت ہی پیارا بچہ بھی ہے۔ یقیناً اس کا بیٹا ہوگا لیکن کسی پر کیا بھروسہ؟ ہوسکتا ہے یہ معصوم بچہ کسی اور کا ہو اور وہ اسے دھوکے سے لے آیا ہو اور بم اس کے نازک پھول ایسے جسم کے ساتھ ہی بندھا ہوا ہو۔ نہیں ___ نہیں ___ ایسا نہیں ہے۔ وہ اور کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن دہشت گرد ہرگز نہیں ہوسکتا۔ سندھی اور دہشت گرد!! سندھی ٹوپی والا تو اپنی دیہاتی سادگی کی بنا پر شہریوں کے بیچ مشکوک اور تعجب کی نشانی (!) ایسا لگتا ہے لیکن دہشت گرد تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ کہیں وہ بڑے بالوں والا، پینٹ شرٹ میں ملبوس کلین شیو نوجوان تو دہشت گرد نہیں ہے؟ وضو بھی درست طریقے سے نہیں کر کے آیا۔ لگتا ہے کسی دوسرے مذہب کا آدمی ہے۔ مسلمانی کا تو بس ناٹک کر رہا ہے۔ ارے! یہ تو کیبل آپریٹر ہے۔ میں نے بیچارے پر خواہ مخواہ شک کیا۔ یہ تو بہت ہی با اخلاق اور ملنسار نوجوان ہے۔ موذن اور پیش امام دونوں سے کیبل فیس نہیں لیتا۔ کہتا ہے ''آپ تو قرآنی تعلیمات والے چینل دیکھتے ہوں گے

آپ سے فیس لے کر میں نے اپنی عاقبت نہیں خراب کرنی۔ ویسے بھی ایک گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔ اگر آپ سے چار سو روپے نہیں لیے تو کیا فرق پڑتا ہے۔'' اپارٹمنٹ کے تمام لوگوں کو ماسوا اس کے خبر نہیں کہ موذن اور پیش امام کے گھروں میں بھی کیبل لائن کمپیوٹر مانیٹر میں لگی ہوئی ہے اور کمپیوٹر مانیٹر تو نام کا لگا ہوا ہے۔ وہ گذشتہ چھ برسوں سے اس راز کو راز رکھے ہوئے ہے۔ آفرین ہو بیچارے پر۔ میں نے تو یونہی شک کیا۔ کیا کیا جائے حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ اپنے آپ پر بھی بھروسہ نہیں رہا۔ واقعی موت کا خوف ہر احساس پر حاوی ہو جاتا ہے لیکن یہ میرے دل کو کیا ہوا کہ اچانک اس کی دھڑکن تیز ہوگئی ہے۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کی گھنٹی سُن رہی ہے۔ ہر آدمی کی اچھی طرح جامہ تلاشی لینی چاہیے لیکن سینکڑوں لوگ ہیں کس کس کی تلاشی لی جائے اور کس کس کو چھوڑ دیا جائے۔ ایک تو رومال بھی نہیں کہ پسینہ پونچھ لیا جائے۔ اب تو نماز بھی شروع ہونے والی ہے اور اکثر خودکش بم دھماکے دورانِ نماز ہی ہوتے ہیں۔ نہیں مجھے اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ اللہ پاک حفاظت کرے گا۔ یہ لو۔ تکبیر بھی ہوگئی۔''

پیش امام نے جیسے ہی سورہ فاتحہ شروع کی تو اُس نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔ اس اپنے آپ پر بہت ترس آنے لگا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ جب دھماکے ہوتے ہیں تو پھر ہر چیز جل کر خاک ہو جاتی ہے، پھر کانوں میں انگلیاں دینے سے کیا فائدہ؟ انگلیاں کانوں سے نکال دیں۔ پیش امام نے دوسری سورہ پڑھنی شروع کی۔

''بس اب دھماکہ ہونے والا ہی ہے۔'' اس نے سوچا۔

''اللہ اکبر۔'' پیش امام کے ساتھ سبھی لوگ رکوع میں چلے گئے۔

''اب اگر انہیں سجدہ نصیب ہو گیا تو بڑے بھاگوان ٹھہرے۔ ارے! خدا کا شکر ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔''

دوسری رکعت شروع ہوگئی۔

''یہ ملا آخری رکعت میں قرآن اتنے مزے سے آہستہ آہستہ کیوں پڑھ رہا ہے؟ کہیں دہشت گردوں سے تو ملا ہوا نہیں ہے؟ اور نماز کو جان بوجھ کر تو طویل نہیں کر رہا کہ دہشت گردوں کو موقع مل جائے؟ ارے! یہ کیا؟ سورۃ البقرہ کے طویل رکوع پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ سورۃ کوثر پڑھ کر نماز مختصر بھی کی جا سکتی تھی۔ لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اب تو کسی لمحے بھی چیخ و پکار شروع ہو جائے گی۔''

''اللہ اکبر۔'' سب رکوع میں چلے گئے۔

''سمع اللہ لمن الحمدہ۔'' اب سجدے میں چلے گئے۔

''یا اللہ! اب تو ہی ان کی حفاظت کرنا، تو ہی ان کو اذیت کے ان لمحات میں سرخرو کرنا۔ سب جانتے ہیں کہ تجھے کسی سجدے کی کوئی ضرورت نہیں، پھر بھی تیری رضامندی حاصل کرنے کے لیے، تیرے آگے جھکنے کے لیے چلے آ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مرنے چلے آئے ہیں۔ صرف تیرے لیے۔''

''اللہ اکبر۔'' سب پیش امام کی آواز پر پہلے سجدے سے اُٹھے۔

''اللہ اکبر۔'' پھر سب آخری سجدے میں چلے گئے۔

''اے خدا! تم ہی مصیبتوں سے بچانے والے ہو، مہربان ہو، یہ سب تیری امان میں ہوں۔''

اس کے دل سے دعائیں نکلنا شروع ہوگئیں۔

''اللہ اکبر۔'' سب سجدے سے اُٹھے۔ اب تشہد کی حالت میں تھے۔

''خدا کا شکر ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ نہیں ___ نہیں ___ سلام پھیرنے تک کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن تشہد اتنا لمبا! پیش امام کو نیند تو نہیں آ گئی۔ کاش! وہ میری آواز سن سکے۔ میرا خوف اور بے چینی کا مارا چہرہ دیکھ سکے۔ کہیں آخری لمحے میں منظر بدل نہ جائے، بھیانک نہ بن جائے۔''

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔''

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔''

پیش امام نے بائیں طرف سلام پھیرا تو مسجد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے سکھ کی سانس لی، پھر وہ شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑی۔

☆☆☆

لیاقت علی

خلش

میں پروفیسر سے معذرت خواہ تھا اور میں خود کو اُس کا مجرم گردانتا تھا۔ مجھے اُس کی کہانی لکھنا تھی لیکن شاید کچھ ایسا تھا جو میری گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ ہر بار گیلی مچھلی کی طرح ایک ثانیے کو میری مٹھی میں آتا اور جونہی میں اُس پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتا، وہ پھسل کر پھر کسی گہرے سمندر کی پاتال میں اُتر جاتا۔

وہ ایک لمحہ، جب پروفیسر چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا اور وہ پے در پے زناٹے کے تھپڑ، لاتیں، گھونسے، مکے اور ڈنڈے برساتے اُسے بازار سے باہر لے جا رہے تھے۔ میں ایک ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری تھامے، دوسرے ہاتھ سے اماں کی انگلی پکڑے تیزی سے اُس مجمع سے نکل رہا تھا۔

میں کہاں نکل رہا تھا؟

اماں مجھے جلد از جلد اُس بھیڑ سے نکالنا چاہ رہی تھی۔ ہر شخص تماشائی تھا۔ خاموش، سہما ہوا یا پھر وہاں سے نکلنے میں مستعد کہ مبادا وہ لاتیں، گھونسے، مکے اور ڈنڈے اسی پر برسنے لگیں۔

لیکن میں رُکنا چاہتا تھا۔

میرے ناتواں بازوؤں میں اُس وقت اتنی سکت کہاں تھی کہ میں انہیں روک سکتا لیکن میری مٹھیاں بھنچی اور دانت پسے ہوئے تھے۔ میں اُن دونوں کے جبڑے توڑ دینا چاہتا تھا لیکن اماں مجھے وہاں سے فوری نکالنے کے درپے تھیں۔ بازار سے باہر نکلنے کا واحد راستہ اب تماشہ گاہ کی صورت اختیار کر چکا تھا جہاں ناک اور منہ سے بہتے خون کے فواروں کے ساتھ وہ چلا رہا تھا۔

''میں پروفیسر ہوں ___''

''اُستاد ___ خبردار ___ کمینے ___ خبردار!!''

پہلے پہل اُس کی آواز میں جلال، تنبیہ، خبر یا دعویٰ تھا، لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے جب وہ بے حال ہونے کو تھا تو اچانک نیند سے جاگے اُس شخص کی مانند دکھائی دے رہا تھا جو ناگہانی کسی آفت پر ہڑبڑا کر اُٹھے اور فوری فیصلے کی تمام قوتوں سے عاری ہو۔ سو اَب اس آفت سے اُس کی مفاہمت محض وہ بلند و بالا چیخیں تھیں، جن سے اب وحشیانہ پاگل پن کی بُو آ رہی تھی۔ وہ جس قدر واویلا کر رہا تھا وہ اُسی قدر اُسے مارنے کے درپے تھے۔ کوئی آگے بڑھ کر اس مار پیٹ کو روکنے والا نہیں تھا۔ سبھی سہمے ہوئے تھے۔

ٹھیلے پر بیٹھے سبزی والے سے صرف اتنی خبر ملی تھی کہ ان دو مارنے والوں میں سے ایک کو پروفیسر نے اپنا موٹر سائیکل چراتے رنگے ہاتھوں دیکھ لیا اور جب پکڑنا چاہا تو اُس نے پہلی اطلاع ایک زوردار تھپڑ کے ساتھ یہ دی کہ وہ خفیہ کا اہلکار ہے

''لیکن تم میرا موٹر سائیکل کیوں چُرا رہے تھے؟''

پروفیسر کے گرج دار استفسار میں اُس لمحے شاید اعتماد تھا!

آس پاس کے لوگوں سے طبقاتی مطابقت کا اعتماد۔

لیکن اچانک نمودار ہونے والے دوسرے اہلکار کے گھونسوں اور ڈنڈوں نے اُسے کسی قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ کچھ کہہ پاتا۔ وہ جو کہنا چاہ رہا تھا اب لاتوں، گھونسوں اور ڈنڈوں کی بارش میں اس قدر بے ربط تھا کہ سننے والوں کو سوائے اس کے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ پروفیسر ہے۔

شاید یہیں کہیں کسی کالج میں!

پھر کچھ ہی دیر میں اُس کی اطلاع نے محض خوف ناک چیخوں کی صورت اختیار کر لی۔

اب اُس کے بال ایک اہلکار کے مضبوط پنجے میں تھے جو زمین پر اُسے گھسیٹتا ہوا بازار سے باہر لے جا رہا تھا، جب کہ دوسرا اہلکار اُسے فٹ بال کو لگائی جانے والی کِکوں کی مانند موٹی پشاوری چپل کے ٹھڈّوں سے آگے بڑھانے میں مدد دے رہا تھا۔ اطلاع، تنبیہ اور چیخ و پکار کے بعد اب پروفیسر کی ہتھیلیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ منت کر رہا تھا کہ اُسے بخش دیا جائے۔ مگر دونوں اہلکاروں کا غصہ تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

میں اُس لمحے کچھ کرنا چاہتا تھا۔

خوف اور غصے سے میرا بدن کانپ رہا تھا لیکن آٹھویں جماعت کا طالب علم چاہے بھی تو کیا کر سکتا تھا؟

وہ اُسے بازار سے باہر اُسی طرح گھسیٹتے ہوئے سڑک تک لے آئے تھے۔ اُس کے کپڑے اب چیتھڑوں میں بدل چکے تھے اور وہ مٹی سے بھوت تھا۔ ایک بے ہنگم خون تھا جو ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں کہاں سے بہہ رہا تھا۔

مگر میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اُس لمحے میری بے بسی سے میری مفاہمت سوائے اُن بے اختیار آنسوؤں کے کچھ نہ تھی کہ جو میری آنکھوں سے بے اختیار بہے چلے جا رہے تھے اور میری ماں اُنہیں خوف سے تعبیر کرتے ہوئے جلد از جلد مجھے وہاں سے بھگا لے جانا چاہتی تھی۔ میں آس پاس پھیلے سینکڑوں تنومند لوگوں کے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ ابھی کوئی نہ کوئی آگے بڑھ کر ان اہلکاروں کا ہاتھ روکے گا یا کم از کم سبب ہی دریافت کر لے گا۔

لیکن میرا اندازہ کس قدر غلط تھا۔

وہ اب سڑک کنارے کھڑے رکشے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ بالوں پر مضبوطی سے پنجہ جمائے اہلکار نے اب دوسرا پنجہ پروفیسر کی پشت پر لپٹی پینٹ بیلٹ پر جمایا اور اُسے منہ کے بل رکشے کے اندر اُچھال دیا۔

گرتے ہی درد سے لبریز ایک چیخ اُس کے خون آلود جبڑے سے برآمد ہوئی تو اہلکار کے منہ

سے بے اختیار نکلا ''بھین چو___''

اور پھر اگلے ہی لمحے وہ اُس کی کمر پر پاؤں رکھتا رکشے میں گھس گیا جب کہ پاس کھڑے اُس کے ساتھی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور نہ جانے کہاں روانہ ہو گئے۔

میں نہیں جان پایا کہ وہ اُسے آخر کہاں لے گئے۔ تھانے یا شاید کسی بھی ایسی جگہ جہاں اُسے آسانی سے ختم کیا جا سکے۔

میں روزانہ کے اخبارات باقاعدگی سے دیکھنے لگا کہ شاید مجھے اُس سے متعلق کوئی خبر مل جائے۔ ہر لاوارث اور سر بُریدہ لاش پر مجھے پروفیسر کا خون آلود چہرہ دکھائی دیتا۔ میں نے کئی مرتبہ بازار کے چکر بھی لگائے کہ شاید مجھے پروفیسر سے متعلق کوئی خبر مل جائے___ لیکن سب انجان تھے۔ سبھی پر ایک تیزی سوار تھی اور کوئی نہیں جاننا چاہتا تھا کہ وہ اُسے کہاں لے گئے یا اُس سے کیا سلوک روا رکھا گیا۔

لیکن نہ جانے کیوں تب سے اب تک میں محسوس کرتا تھا کہ میں اُس کا مجرم ہوں۔ ایک گہری خلش میرے اندر کہیں چھپی ہوئی تھی۔

میں اُس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اُس کے دکھ کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔

اُسے بیان کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ لمحہ!

وہ ایک لمحہ ہر بار گیلی مچھلی ثابت ہوتا۔ کبھی لفظ نہ ملتے۔ کبھی جذبات ایسا غلبہ پاتے کہ تحریر کانپتے ہاتھوں سے ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی صورت اختیار کر لیتی۔

کبھی ایک سطر تو کبھی دو۔

کہیں زبانی اظہار تو کبھی محض تصور، لیکن وہ ساری ذلت میری دسترس میں نہ تھی کہ جو اُس روز پروفیسر محسوس کر رہا تھا۔

میں کالج گیا تو دانستاً اپنے بیٹھنے کے لیے ہمیشہ پچھلی نشستوں کا انتخاب کیا۔ جب کبھی کوئی پروفیسر ہماری کلاس میں داخل ہوتا، تو میں کسی کلاس فیلو کی آڑ میں چھپ جاتا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ کر یہ نہ کہے کہ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟___''

''ڈرپوک___'' ''بزدل___''

''اُس روز بھاگ گئے تھے؟''

نہیں ہرگز نہیں___

میں بزدل ہرگز نہیں تھا۔ اگر اماں میرے ساتھ نہ ہوتیں تو میں اینٹ کے کسی ٹکڑے سے اُس بال گھسیٹنے والے اہلکار کا سر پھوڑ دیتا۔

دانتوں سے اُس کے ہاتھ نوچ لیتا۔ اُس کے منہ پر تھوک دیتا۔

یا..... یا کچھ بھی ایسا ضرور کرتا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

لیکن اماں میرے ساتھ .....

نہیں میں بزدل ہرگز نہیں تھا۔

لیکن اُس لمحے میں کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پایا، سب آناً فاناً ہوا اور ایک گہرا بوجھ میرے سینے پر لادتا رخصت ہو گیا۔

میں نے بہت سی کہانیاں لکھیں۔ بہت سے کردار خلق کیے، لیکن ہر جگہ پروفیسر کوئی ان دیکھا کردار بن کر سامنے آتا اور کہتا سب جھوٹ لکھ رہے ہو۔

''کیا تم نے میری کہانی لکھی؟''

''یا لکھنے سے بھی ڈر گئے ہو___ بزدل!___''

نہیں میں بزدل نہیں تھا۔

میں اُس کرب کو بیان کرنا چاہتا تھا جو ایک گہری خلش کی صورت میرے سینے میں موجود تھا۔ میں کسی تحریر، تصویر میں یا کسی کینوس پر اسے اُتارنا چاہتا تھا۔ میں اپنی ہر کہانی پروفیسر کو مرکزی کردار جان کر شروع کرتا لیکن پھر لفظ میرا ساتھ نہ دیتے۔ واقعہ ذہن سے چپکے ہونے کے باوجود دسترس میں نہ رہتا اور میں جب قلم رکھ چکتا تو پروفیسر چپکے سے میرے کانوں میں سرگوشی کرتا___ بزدل!!

میرا احساسِ جرم بتدریج بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ پھر ایک روز عجیب ہوا!

میں کمرۂ امتحان میں بیٹھا امتحان دے رہا تھا۔ سوالیہ پرچہ میرے سامنے آیا تو میرا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔ اماں کے باندھے امام ضامن کو میں نے بائیں بازو پر شرٹ کے نیچے ٹٹول کر دیکھا اور اطمینان سے مسکرا دیا۔ بعض اوقات فطرت کو ماؤں کے یقین کس قدر عزیز ہوتے ہیں۔ سارا پرچہ میری تیاری کے عین مطابق تھا۔ میں نے جواب کے لیے منتخب کیے گئے سوالات پر ٹک کیا، جوابی شیٹ پر سیاہ مارکر سے حاشیے لگائے اور سب سے عمدہ تیار سوال کا نمبر مارکر سے خوب صورتی سے لکھا کہ اچانک مجھے پروفیسر کی سرگوشی پھر سنائی دی___

''بزدل___!''''خود غرض___!''

''میری کہانی نہیں لکھو گے؟''

میں نے محسوس کیا میں جو کہنا چاہتا تھا آج کسی فلم کی صورت میرے سامنے چل رہا تھا۔ الفاظ، جذبات، کیفیات، غرض سبھی کچھ آج میری گرفت میں تھے اور میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن آج گیلی مچھلی مکمل طور پر میری گرفت میں تھی۔

تو کیا آج میں اس بوجھ کو جو گزشتہ کئی برس سے میرے سینے پر سوار ہے، ہلکا کر سکتا ہوں؟

گہرے اطمینان کی ایک تیز رو میرے اندر تک سرایت کر گئی۔

سرشاری سے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے سوالیہ پرچے پر ٹک کیے تمام سوالات پر کراس کیا اور جوابی شیٹ پر مارکر سے لکھے خوش خط سوال نمبر کے نیچے پروفیسر کی کہانی لکھنا شروع کی۔

بھرے بازار میں گھسٹتا ہوا پروفیسر اور اُس کے جسم سے اُبلتا خون اب محرکات، واقعات اور اثرات سبھی کچھ خود لکھ رہا تھا۔

سر___ شیٹ! سر___ شیٹ!

میں شیٹ پر شیٹ لیتا گہرے اطمینان کے ساتھ لکھتا چلا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے سر پر پتھر کی بھاری سلیں ہیں جو کوئی آہستہ آہستہ اُٹھاتا چلا جا رہا ہے۔ ہر سِل اُٹھنے پر میرے پاؤں زمین پر اور مضبوط ہوتے جا رہے تھے اور ایک گہری سرشاری مجھے اپنے حصار میں لپیٹے جا رہی تھی۔

پھر آخری سِل بھی کسی نے چپکے سے اُٹھالی۔

میں پہلی بار خود کو اس قدر ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

''سٹاپ رائٹنگ!'' ایک آواز میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے تمام شیٹس نتھی کیں اور سر اُٹھا کر آس پاس بیٹھے اپنے دیگر ہم جماعتوں پر نگاہ دوڑائی تو سبھی رشک بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔

معاً میرے دل میں خیال آیا میں اس کہانی کو کیونکر حاصل کر سکتا ہوں؟

یونیورسٹی کے قوانین اس کی اجازت نہیں دیتے تھے تاہم میں نے ممتحن کے نام نوٹ میں ایک درخواست لکھی کہ اس کہانی کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس کی نقل کسی طرح مجھے اس پتہ پر بھیج دیجیے۔ میں عمر بھر مشکور رہوں گا۔

میں امتحان دے کر گھر آ گیا۔ شاید زندگی کا سب سے کامیاب امتحان۔

اس سے پہلے کسی امتحان نے مجھے اس قدر ہلکا پھلکا نہیں کیا تھا۔ میں بے حد خوش تھا لیکن پروفیسر کی وہ کہانی اپنے پاس محفوظ نہ رکھ پانے کا رنج بہرحال مجھے تھا۔

بہت دنوں بعد جب ایک روز میں صبح معمول کے مطابق ناشتہ کر رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے عمر رسیدہ ایک شخص آنکھوں پر دبیز شیشوں کا سفید چشمہ لگائے، پرانی وضع کے پینٹ کوٹ میں ملبوس، ہاتھ میں ایک لفافہ تھامے کھڑا تھا۔ میرا نام جاننے پر اُس نے وہ لفافہ مجھے تھمایا اور خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

برسوں پہلے بالوں سے گھسٹتے خون آلود پروفیسر کے نقوش میرے ذہن پر نقش تھے۔ وقت نے اُنہیں ایک گہری متانت تو ضرور بخش دی تھی مگر اتنا نہیں بدلا تھا کہ مجھے پہچاننے میں دِقت ہوتی۔

☆☆☆

سجاد مرزا

اقدار کی صلیب

رکھی ہے جب سے دوش پر اقدار کی صلیب
ہر آدمی شکارِ روایت بنا رہا

کرتا ہے کون اپنے اسم کی یہاں تلاش
اس دَور میں معاش کی فکروں نے کھا لیا

افسانوی فضا میں کہاں ارتباطِ نظم؟
ہر لفظ ایک حلقۂ زنجیر بن گیا

اشعار کے گلو میں کہاں نازکی رہی
ہر آدمی نے نقد کا خنجر چلا دیا

ہم نے ادب کے نام کو بیچا کچھ اس طرح
جو کچھ نہ چھپنا چاہیے تھا وہ بھی ہے چھپا

اب لاشعور کس لیے رہنِ شعور ہے
فوقِ شعور ، ذات کے اندر کا راستہ

اب نفسیات کون سے سانچے میں ڈھل گئی
اب تو کوئی بکھیڑا نہیں فکریات کا

اب تو نہیں مسائلِ تقسیمِ فکروفن
اب شخصیات کا ہے اک چکر سا چل پڑا

ذہنی سکون ہو کہ ہو جنسی طمانیت
قحبہ گری ہے آج بھی لفظوں کا سلسلہ

رجعت پرست ہو کہ ترقی پسند ہو
شیشے کے گھر میں بیٹھ کر پتھر ہے پھینکتا

بعدِ جمالیات کی تحریک لفظ لفظ
لفظوں میں خواہشات کا جادو چھپا ہوا

جدت ہو کامیاب روایت کے ساتھ ساتھ
انسان کے احساس کا پھیلے گا دائرہ

تکمیل پا سکی نہ روایت کی داستاں
ہر نسل کا مزاجِ ادب ہے جدا جدا

کیوں کر سمٹ کے رہ گئی بعد الطبیعات
مغرب کے نظریات سے دامن ذرا بچا

غیروں کی بات من کو لبھاتی ہے خوب خوب
اجداد کے علوم کو بھی دیکھ لے ذرا

اپنا ادب ہو ، غیر کی میزانِ نقد ہو
''ڈی کنسٹرکٹ'' کر گیا دیکھو وہ ''ساختہ''

نثری ادب کی بات ہو یاروں میں گر کبھی
ماہم کا ایلیٹ کا بگھاریں گے فلسفہ

اب سارتر ، ڈکنز بھی پڑھنے کی چیز ہیں
ڈوبا ہوا ہے اپنی ہی دنیا میں کافکا

کیا کیا فراڈ کر گیا دیکھو فرائڈ کو
اپنے ہی کمپلیکس میں وہ مبتلا رہا

چیخوف اور موپساں کی سعی ناتمام
افسانوی ادب کا ہوا ختم تذکرہ

منٹو ، کرشن ، بیدی وعصمت ، پریم چند
پڑھتا ہے کون ان کے فسانوں کو ہم نوا

فیض و مجید و راشد و ساحر کی شاعری
سجاد کیوں ہے گردشِ دوراں میں مبتلا

اسلم ، عزیز ، شوکت و رضیہ فصیح کے
ناول کو راس آ نہ سکی آج کی فضا

اختر ریاض و تارڑ و طاہر و انشا جی
سفرِ دیارِ غیر میں اب کیا رہا مزا

ممتاز ، احتشام ، کلیم و سہیل و زور
مجنوں ، سلیم ، عسکری تنقید ناروا

اوراق ہو ، فنون ہو یا سیپ یا نقوش
مدت کے بعد ہوتا ہے ادب ان کا درشنا

اب ڈائجسٹ عام ہیں ردی میں مل رہے
ان کا مواد قاری کے دل کو کھینچتا

اخبار میں ادب کے جراثیم گھس گئے
قاری ادب کے نام سے اب بھاگنے لگا

ہے سوچنے کی بات ، یہ سوچیں گے اہلِ نقد
کیا کچھ ادب کے نام سے لوگوں نے ہے لکھا

قدریں ادب کی کس طرح پامال ہو گئیں
کیا کیا خلیل خاں نے اُڑائی ہے فاختہ

شاعر ، ادیب اپنے مکانوں میں بند ہیں
دستک بھی دو تو کون ہے کھڑکی سے جھانکتا

کیسا ادب ہے آج کتابوں کی شکل میں
اک ایک شخص سر کو جھکائے ہے سوچتا

مینڈک کنویں کے بن گئے جیسے تمام لوگ
فکرِ جدید کو نہیں ملتا ہے راستہ

تخلیق کے عمل سے ہیں اذہان بدگماں
پیرِ مغاں نے بند درِ میکدہ کیا

سجاد آؤ تازہ ہواؤں میں سانس لیں
ہوتا رہے گا لکھنے لکھانے کا مشغلہ

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

دشتِ امکانِ رہگذر میں رہے
ہم مسافر سدا سفر میں رہے

رقصِ تخلیق رُک نہیں سکتا
جب تلک خوں دل و جگر میں رہے

دل کی تنہائی کا علاج ، غلط
یہ تو جوہر سدا بشر میں رہے

ہائے اُس جسمِ مرمریں کے خطوط
کیا مناظر مری نظر میں رہے

رات بھر یاد آیا رُوئے نگار
رات بھر دامنِ سحر میں رہے

آج وہ شوخ گھر سے نکلے گا
ہر کوئی اپنے اپنے گھر میں رہے

اے حبیبؔ ، اُس کو چاہنے والا
کیا مقاماتِ خیر و شر میں رہے

قاضی حبیب الرحمٰن

عشق ہے دل دریا کی موج
دھنک کی لہر ، ہوا کی موج

برس برس گئے ہر سُو خواب
دیکھی ، زُلف گھٹا کی موج

بال کہ لہریں لیتے ناگ
چال کہ بادِ صبا کی موج

کھلتے نہیں اُس شوخ کے بھید
خون کہ رنگِ حنا کی موج

گونج اُٹھے سب دشت و جبل
اُبھری درد صدا کی موج

آنکھ کی ہے کچھ اور طلب
لب پر اور دُعا کی موج

دل میں خلقِ خدا کا ڈر
رُخ پر خوفِ خدا کی موج

دونوں عالم ڈوب گئے
قہر ہے بحرِ اَنا کی موج

لے گئی دُور بہا کے حبیبؔ
دیکھی ، آہِ رسا کی موج

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

وہ جو خواہش تھی کبھی ، اور ہمیشہ کے لیے
رہ گئی دل میں دبی ، اور ہمیشہ کے لیے

ایک خواہش ہے کہ ہر لحظہ بدلتی خواہش
کاش ، پوری ہو ابھی ، اور ہمیشہ کے لیے

ساتھ رہتی ہے بہر حال، دل و جاں کی طرح
اک نہ اک تشنہ لبی ، اور ہمیشہ کے لیے

بات جو لب پہ بھی آئی نہ تھی اُن کے، وہ بھی
سب سمجھ لی تھی جبھی ، اور ہمیشہ کے لیے

اور یہ ایک ''ہمیشہ'' بھی بدل جاتا ہے روز
روز کہتے ہیں سبھی ، اور ہمیشہ کے لیے

حق و باطل کا تعین ، نہیں آساں کوئی
میں تو کہتا تھا تبھی ، اور ہمیشہ کے لیے

اپنے مطلب کے نکل آتے ہیں کیا کیا معنی
دل کی یہ بوالعجبی ، اور ہمیشہ کے لیے

بسکہ اور اِس کے سوا کچھ نہیں دیں سے مقصود
صرف ، دُنیا طلبی ، اور ہمیشہ کے لیے

کہیں بھرتی ہی نہیں نیتِ دل ، کیا کیجے !
وہی ، آوارہ شبی ، اور ہمیشہ کے لیے

سنتے ہیں موت کے اُس پار کوئی صورتِ زیست
طے ہو یہ مرحلہ بھی ، اور ہمیشہ کے لیے

دین و دُنیا سے مجھے بس یہی کافی ہے حبیبؔ
اک خُدا ، ایک نبی ، اور ہمیشہ کے لیے

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

زمیں کے عکس سے ہفت آسمان روشن ہے
اِس اک چراغ سے سارا جہان روشن ہے

جمالِ یار سے روشن ہوئی نگاہ مری
مری نگاہ سے کون و مکان روشن ہے

وفورِ جوشِ نمو سے لہک رہے ہیں چمن
فروغِ رنگ سے سب خاکدان روشن ہے

چہار سمت جو یہ نَو بہ نَو تماشا ہے
چہار سمت ، یہ اپنا ہی دھیان روشن ہے

یہ کارگاہِ محبت ہے ، دیکھ کر صاحب!
بہر نگاہ ، یہاں امتحان روشن ہے

غضب ہے مسئلۂ ہست و بود کی منزل
بجھا بجھا ہے یقیں اور گمان روشن ہے

نہ جانے ،آج یہ کس دشتِ ہو میں آ نکلے
سیاہ دھوپ کا اک سائبان روشن ہے

یہ حکم تھا کہ ہدف آپ تیر تک پہنچے
سو جملہ تیر بدامن ، کمان روشن ہے

نہ کوئی طرزِ شکایت ، نہ کوئی حرفِ نیاز
نہ کوئی آہ ، نہ کوئی اذان روشن ہے

اِدھر پڑی ہے کنارے پہ اک شکستہ ناؤ
بھنور کے بیچ اُدھر بادبان روشن ہے

ابھی سنو گے ، اُڑا لے گئی ہوائے بہار
ابھی جو شاخ پہ اک آشیان روشن ہے

ہر آن ، لمحۂ موجود ، کٹتا جاتا ہے
گئی رُتوں کی وہی آن بان روشن ہے

پلک جھپکتے ہی عہدِ عتیق جاگ اُٹھا
اندھیری رات میں اندھا مکان روشن ہے

سیاہ راکھ میں لپٹے ہوئے صحیفوں میں
پرانے وقتوں کی اک داستان روشن ہے

عجب طلسمی اشارے دکھائی دیتے ہیں
اُبھرتا ڈوبتا کوئی بیان روشن ہے

کسی اُجاڑ حویلی کے ایک کمرے میں
بغیر شمع کے ، اک شمع دان روشن ہے

ڈھہے مکانوں کے ملبے کے درمیان کہیں
بجھے زمانوں کا ایک پیچوان روشن ہے

یہ راہداری سے کچھ آگے ، ایک کونے میں
لہو میں تر بہ تر اک نوجوان روشن ہے

نگاہ دائرے بُنتی ، طواف کرتی رہی
جدا ہے تن سے مگر کیسی ران روشن ہے

کٹے پھٹے ہوئے جسموں کے جابجا انبار
بہارِ زخم سے سب دودمان روشن ہے

کسی کے ہونٹوں پہ چھوڑ آیا کوئی اپنے ہونٹ
کسی کے منہ میں کسی کی زبان روشن ہے

یہ کون دھڑ ہیں جو اپنے سروں کو ڈھونڈتے ہیں
خود آگہی کا مگر سازمان روشن ہے

وہی بدلتا ہے ارض و سما کی ترتیبیں
وہ جس کے اسم سے جسموں میں جان روشن ہے

غروب ہوتے دنوں کی بساط سے آگے
ہوا کے دوش پہ اک نردبان روشن ہے

بچھی ہے راہ میں ہر گام ، منزلِ مقصود
بچشمِ شوق ، سفر کا نشان روشن ہے

بس اک خیال کی لو سے دمک رہا ہے وجود
بس ایک پرتوِ جوہر سے کان روشن ہے

ازل ازل سے جو ہے ماورائے فہم ،حبیبؔ
ازل ازل سے وہی چیستان روشن ہے

☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید

آرزو یہ تھی بکھیریں اپنی کرنیں صبح تک
روتے روتے بجھ گئی ہیں ساری شمعیں صبح تک

وقت کی گزری عبارت کی تلاوت کے لیے
رات کی تنہائیوں میں آؤ ، گھومیں صبح تک

دن کا سورج ان پہ لکھے گا ، انوکھے تبصرے
ہم نے جو تالیف کیں دل کی کتابیں صبح تک

شب کو مٹھی میں پرندوں کی طرح وہ سو گئیں
ہو گئیں زندہ ہتھیلی پر لکیریں صبح تک

زندگی کے راستے میں جو کہیں گم ہو گئے
ڈھونڈتی ان کو رہیں خوابوں میں آنکھیں صبح تک

آشیانے میں نہ جب لوٹے پرندے تو سدیدؔ
دُور تک تکتی رہیں شاخوں میں آنکھیں صبح تک

ڈاکٹر انور سدید

پہلے اس زلف میں سمٹ کر دیکھ
بعد میں زندگی سے کٹ کر دیکھ

کس قدر ہے خنک فضا اس کی
اپنے سائے میں تو سمٹ کر دیکھ

رہ گیا ہے جو پشت کے پیچھے
اسی منظر کو پھر پلٹ کر دیکھ

کیا ہے پُر کیف بانٹنے کا عمل
اپنے بچوں میں آپ بٹ کر دیکھ

اس کے پیچھے بھی ایک سورج ہے
کبھی بادل کی مثل پلٹ کر دیکھ

کیا ہے خوشبو، وطن کی مٹی میں
سر پر ڈال اور اس میں اٹ کر دیکھ

برق رفتار یہ زمانہ ہے
اس کو انور سدیدؔ ہٹ کر دیکھ

خاور اعجاز

پرانے لفظ کے اندر نئے مفہوم ہوتے ہیں
سو اُن پر کھلتے ہیں جو صاحبِ مقسوم ہوتے ہیں

زمانہ جانتا ہے اپنی اس معجز نمائی کو
وہیں روشن بھی ہوتے ہیں جہاں معدوم ہوتے ہیں

نکلتے ہوں کسی دوری سے کچھ آثار قربت کے
بڑی مشکل سے ایسے سلسلے معلوم ہوتے ہیں

جو اپنی آنکھ میں رکھتے نہیں اپنے جہانوں کو
سو اُن کے خواب بھی تعبیر سے محروم ہوتے ہیں

پھر اک ساعت انہیں لے آتی ہے بامِ ثریا پر
زمانوں سے جو تیرے وقت کے محکوم ہوتے ہیں

☆☆☆

خاور اعجاز

سارا ماحول سراسر ہے خسارے کا ابھی
کوئی سودا نہیں بازار میں وارے کا ابھی

منتظر ہوں کہیں اک تازہ اُفق کھلنے کا
راستہ دیکھ رہا ہوں میں ستارے کا ابھی

ابھی کردار ادا کرنا ہے دریا کا مجھے
رُخ بدلنا ہے مجھے سوچ کے دھارے کا ابھی

مجھ کو تھامے ہوئے اک اور جہاں کا غم ہے
متمنی نہیں دنیا کے سہارے کا ابھی

شوقِ سیرابیِ صحرا میں بہا جاتا ہوں
میں نے سوچا ہی نہیں خواب کنارے کا ابھی

خاور اعجاز

جاگتا ہے در و دیوار میں جادو کوئی
شب حویلی میں گرفتار ہے خوشبو کوئی

پانیوں میں کوئی مہتاب اُتر آیا ہے
بال کھولے ہوئے بیٹھا ہے لبِ جُو کوئی

میرے اطراف میں پھیلا ہوا ہُو کا عالم
جیسے موجود ہے نابود میں ہر سُو کوئی

ریت کا ڈھیر ہوئی نخل تمنا کی نوید
سرِ صحرائے گماں گم ہوا آہُو کوئی

رشتۂ درد نبھانا تو بہت دُور کی بات
پونچھنے تک نہیں آیا مرے آنسو کوئی

اِسی اُمید میں دوبارہ نہ کھولیں آنکھیں
شاید آجائے مرے خواب میں جگنو کوئی

☆☆☆

خاور اعجاز

دہر میں صورتِ بنجارہ رہے ہیں ہم لوگ
مگر اک قریے میں دوبارہ رہے ہیں ہم لوگ

کبھی دھرتی کبھی آفاق کی حد پر چمکے
کہیں جگنو تو کہیں تارہ رہے ہیں ہم لوگ

ایک ہی راہ میں ہر بار قدم بھٹکے ہیں
ایک ہی سمت میں آوارہ رہے ہیں ہم لوگ

برف کی طرح جمے بیٹھے ہیں آخر آخر
اوّلِ عشق میں انگارہ رہے ہیں ہم لوگ

لمحۂ وصل میں کوئی ہمیں یکجا کر دے
موسمِ ہجر میں صد پارہ رہے ہیں ہم لوگ

خاور اعجاز

دنیا مری منزل ہو کہ عقبیٰ نہیں معلوم
کس سمت نکل جائے یہ رستہ نہیں معلوم

ہم شہر کو مشرق میں کہ مغرب میں بسائیں
کس رُخ پہ چمکتا ہے ستارا نہیں معلوم

خود اُس کو کنارے کی خبر کوئی نہیں ہے
صحرا کو بھی کچھ وسعتِ صحرا نہیں معلوم

مدت سے یہی ریت ہے بس حدِ نظر تک
کب خشک ہوا ہوگا یہ دریا نہیں معلوم

اُس اوج پہ کیوں اذن مجھے پھر نہیں دیتا
کیوں رہتا ہے وہ یوں تنِ تنہا نہیں معلوم

ماضی سے بچھڑ کر تو کوئی حال نہیں ہے
کس حال میں پہنچائے گا فردا نہیں معلوم

اک خواب کے پردے میں چلے جاتے ہیں اور بس
اُٹھتا ہے کہاں جا کے یہ پردا نہیں معلوم

اس خاک سے اور اس کی فضا سے ہے سبھی کچھ
راس آئے کوئی اور بھی دنیا نہیں معلوم

کچھ بنتے ہوئے ، مٹتے ہوئے نقشِ تمنا
کب تک ہے نظر میں یہ نظارا نہیں معلوم

آنکھوں سے اچانک ہی ہٹا تھا کوئی منظر
پھر کیا تھا سرِ بامِ تماشا نہیں معلوم

☆☆☆

خاور اعجاز

ہمارے ہاتھ سے سب کچھ نکل بھی سکتا ہے
دیا جلائیں تو منظر بدل بھی سکتا ہے

نوائے شوق جنوں خیز ہو بھی سکتی ہے
ہوا ہو تیز تو دریا اُچھل بھی سکتا ہے

گزر کے شعلۂ ہستی سے خاک ہو جائے
تو آدمی نئے سانچے میں ڈھل بھی سکتا ہے

کہیں جو چھولوں اُسی اِک رُکے ہوئے پل کو
تو یہ زمانہ مرے ساتھ چل بھی سکتا ہے

شرارِ شوق سے مَس ہونے کی ہے دیر فقط
چراغ بجھ ہی گیا ہے تو جل بھی سکتا ہے

☆☆☆

حصیر نوری

کیا حقیقت ہے مرے سامنے لایا جائے
کرب کی سولی پہ مجھ کو نہ چڑھایا جائے

صاف و شفاف عمل کر کے دکھایا جائے
سب کو اس دَور میں انصاف دلایا جائے

میرے احساس کا ہر پھول شگفتہ ہے ابھی
دشت کی دھوپ میں مجھ کو نہ جلایا جائے

اس کو معلوم ہے، اس دل کی حقیقت کیا ہے
اتنا ناداں تو نہیں وہ کہ بتایا جائے

میں بہت دیر سے جاگا ہوں پہ جاگا تو سہی
تھپکیاں دے کے مجھے پھر نہ سلایا جائے

اک الاؤ سا مرے جسم کے اندر ہے ابھی
گر ہے ممکن تو مجھے اس سے بچایا جائے

جھوٹ کو سچ سے بدلنے کا ہنر ہے یہ حصیر
آؤ مل جل کے بہت شور مچایا جائے

حصیر نوری

رہ گئی زیست مری وادیٔ صحرا بن کر
سانس لیتا ہے جہاں وقت بگولا بن کر

عزتِ نفس کا احساس اگر ہے تو رہو
مسکراتے ہوئے ماحول کا حصہ بن کر

خامشی میری پراسرار ہے سب ہی کے لیے
تیرا ہمدرد بنوں کیسے میں سچا بن کر

صدمہ سہنے کی سکت اور نہیں ہے مجھ میں
کوئی اپنا نہ کہے مجھ کو پرایا بن کر

جسم میں اب بھی ہے پھولوں کے دباؤ کا اثر
درد خوشبو کی طرح مجھ میں ہے کانٹا بن کر

خشک صحراؤں کو سیراب کروں کیسے یہاں
اب تری یاد بھی آتی نہیں دریا بن کر

اب ہمیں جو بھی سمجھتے رہیں دنیا والے
ہم تو زندہ ہیں یہاں صرف تماشا بن کر

لمحے لمحے کا یہ اعلان ہے ، ہشیار حصیر
آنے والا کوئی طوفان ہے خطرہ بن کر

☆☆☆

حصیرؔ نوری

اپنی اپنی خواہشوں میں آدمی کھویا ہوا
چل رہا ہے راہ میں جیسے کوئی سویا ہوا

کھل رہا ہوں میں چمن اندر چمن بن کر گلاب
میرے ہر عضوِ بدن پر زخم ہے بویا ہوا

ساعتوں کے دل کی دھڑکن سن رہا ہوں دم بہ دم
لوگ یہ سمجھے کہ میرا ذہن ہے سویا ہوا

کر رہا ہے وہ گلابوں کی تمنا کس لیے
ایک اک کانٹا ہے جس کے ہاتھ کا بویا ہوا

دُور تک باد و مسرت کا نہیں نام و نشاں
بارشِ غم سے ہمارا شہر ہے دھویا ہوا

جوتنِ آساں تھے، سفر میں تیز دم دیکھے گئے
جس کو منزل پر پہنچنا تھا وہ ہے سویا ہوا

کیفیات دل نگاہوں سے جھلکتی ہے حصیرؔ
جب کبھی ہنستا ہے کوئی آدمی رویا ہوا

☆☆☆

حصیرؔ نوری

گردشِ حالات سے یہ تو مجھے حاصل ہوا
جادۂ دشوار پر چلنے کے میں قابل ہوا

روز افزوں بڑھ رہی ہے اب گھٹن حالات کی
اس جہاں میں سانس کا لینا بھی اب مشکل ہوا

آدمی احساس کے زنداں میں ہے اب تک اسیر
کیا بتاؤں زندگی میں درد کیوں شامل ہوا

ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دیکھتا ہوں دوستو
آدمی ، انسان کا جب سے یہاں قاتل ہوا

بے یقینی اس قدر حالاتِ حاضر ہو گئے
اب تو اپنا مسکرانا بھی بہت مشکل ہوا

آ گیا ہے میری باتوں پر یقیں ان کو مگر
سوچتا ہوں یہ شرف کیسے انہیں حاصل ہوا

ایک ہلچل ہو رہی ہے شہرِ فن میں اے حصیرؔ
با عمل فنکار کی صف میں جو میں شامل ہوا

شارق بلیاوی

شوق وہ دل نے دلایا مجھ کو
لاکھ میں ایک تو بھایا مجھ کو

بے خبر وقت میری ذات سے تھا
یا کہ دانستہ بھلایا مجھ کو

زیست دیکھی ہے کھلی آنکھوں سے
عمر بھر خواب نہ آیا مجھ کو

وہ تو چلتا ہی گیا ساتھ مرے
دشت نے سمجھا تھا سایا مجھ کو

دھوپ نے تجھ کو توانائی دی
اور موسم نے سجایا مجھ کو

پھر مری ذات سے شکوہ کیسا
اپنی مرضی سے بنایا مجھ کو

رونا دھونا تو بڑی بات ہوئی
مسکرانا بھی نہ آیا مجھ کو

شخصیت میری عجب تھی شارقؔ
کوئی رویا کوئی گایا مجھ کو

شارق بلیاوی

پابندیٔ گفتار سے رُکتی ہے کہاں بات
ہو جاتی ہے آنکھوں کے توسّل سے یہاں بات

ہے مصلحت اندیش بہت منظرِ خاموش
ہوتا ہے عیاں حادثہ رہتی ہے نہاں بات

سیکھا ہی نہیں بات بنانے کا ہُنر میں
اور بات بنائے بِنا بنتی ہے کہاں بات

ہر بات کے اظہار کا انداز الگ ہے
ہوتی ہے کہیں نرم کہیں شعلہ فشاں بات

رکھنا ہے بھرم زخم کا تو آہ نہ کرنا
اس طرح بگڑ جائے گی اے دردِ نہاں بات

انسان چھپا ہوتا ہے گفتار کے اندر
کر دیتی ہے انسان کی فطرت کو عیاں بات

ہر بات کا بھی وزن ہے وقعت ہے بھرم ہے
سو بات وہیں کیجیے بنتی ہو جہاں بات

ہم دونوں ہی مجرم ہیں انا ذات کے شارقؔ
کہنے کے لیے کچھ بھی یہاں ہے نہ وہاں بات

☆☆☆

صابر عظیم آبادی

خوشی نایاب ہوتی جا رہی ہے
محبت خواب ہوتی جا رہی ہے

کیا جس موج پر میں نے بھروسہ
وہی گرداب ہوتی جا رہی ہے

نقاب الٹا ہے اس نے جس گھڑی سے
زمیں مہتاب ہوتی جا رہی ہے

تری جلوہ طرازی دیکھنے کو
نظر بے تاب ہوتی جا رہی ہے

صبا کے لمس سے سارے چمن میں
کلی شاداب ہوتی جا رہی ہے

تری بھیگی ہوئی آنکھوں کی مستی
شراب ناب ہوتی جا رہی ہے

جو تھی فصلِ زمینِ عشق صابؔر
وہ زیرِ آب ہوتی جا رہی ہے

صابر عظیم آبادی

جو آئے تھے کبھی پھولوں پہ چل کر
گئے وہ اس چمن سے ہاتھ مل کر

مرے حالات کو بھی دیکھ لیتے
حریمِ ذات سے باہر نکل کر

اُنہیں پہچاننا ہے کارِ مشکل
یہاں بیٹھے ہیں جو چہرے بدل کر

ہماری زندگی کا کیا بھروسہ
چراغِ راہ بجھ جاتے ہیں جل کر

الجھنا مت کسی کے مسئلے میں
جو اپنے مسئلے ہیں اُن کو حل کر

جو تیری یاد کا لہرایا آنچل
پلک پر رہ گئے آنسو مچل کر

وہی گرتے ہیں ٹھوکر کھا کے صابؔر
جو چلتے ہی نہیں رستے سنبھل کر

☆☆☆

منیر راہی

زمیں کا ایک دھارا لگ رہا ہے
یہ دریا بھی کنارا لگ رہا ہے

مری آنکھیں ادھوری ہو گئی ہیں
ترا چہرہ بھی کیسا لگ رہا ہے

بہت سے لوگ آتے جا رہے ہیں
مری دنیا میں میلہ لگ رہا ہے

کسی کے خواب پورے ہو رہے ہیں
کسی کا عشق سچا لگ رہا ہے

ہمیں دے دو کسی کی روشنی بھی
ہمیں سورج ادھورا لگ رہا ہے

اُسے سب لوگ سچا کہہ رہے ہیں
ہمیں کیسے وہ جھوٹا لگ رہا ہے

منیر راہی

جہاں بس ہجر کا غلبہ ہوا ہے
ہمیں تو عشق بھی ایسا ہوا ہے

جہاں پر عکس اپنا بن رہا تھا
وہاں سے آئینہ ٹوٹا ہوا ہے

اِسی سے برکتیں آئیں بہت ہیں
کسی کا نام جو رکھا ہوا ہے

مرا وہ عشق بھی سچا کہاں تھا
مرا یہ عشق بھی جھوٹا ہوا ہے

یہ دل بستی تو اُجڑی ہی رہے گی
اِسے تو عشق نے لوٹا ہوا ہے

☆☆☆

صاحبؔ نوید

سکوتِ شب ہے تیری آرزو ہے اور پورا چاند
مرے نغمات پر رقصاں سبُو ہے اور پورا چاند

ستاروں نے کہا اے شمع اب تم سو رہو جا کے
کہ جب جلنے کو یہ آشفتہ مُو ہے اور پورا چاند

نمازِ شکر کی خاطر اے زاہد حاجتِ یم کیا
مرے اشکوں ہی سے میرا وضو ہے اور پورا چاند

تمہارا نام لینا دن میں مشکل ہے مگر شب میں
ستاروں سے تمہاری گفتگو ہے اور پورا چاند

شبِ تنہائی سے صاحبؔ ہو تم ناواقفِ احوال
مری تنہائی میرے رُوبرو ہے اور پورا چاند

ظفر اقبال نادر

اپنے حق میں جب وہ پاتے کچھ نہیں
غور سے سنتے سناتے کچھ نہیں

جان کے بدلے میں لمحے وصل کے
طے ہوا سودا ، چھڑاتے کچھ نہیں

خامشی کا وہ گئے باعث چھپا
سو گئے اِک رٹ لگاتے ''کچھ نہیں''

تیری خاطر ہی چمن میں پھول ہیں
تم کو دیکھیں ہم کو بھاتے کچھ نہیں

عاشقوں کو احمقوں کی چاٹ ہے
جاں تلک دیتے ہیں پاتے کچھ نہیں

اُن کو اقرارِ محبت سے گریز
حوصلہ تو ہم بھی پاتے کچھ نہیں

☆☆☆

''حروفِ زر'' (قارئین کے خطوط)

''انگارے'' کا ''منٹو نمبر'' مل گیا ہے۔ منٹو کی پچاسویں برسی پر آپ نے ان کے شایانِ شان نمبر پیش کیا ہے۔ اس کی ضخامت اگرچہ زیادہ نہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ آپ نے مختصر سے ''اطلاع نامے'' پر متعدد غیر مطبوعہ مضامین حاصل کیے اور منٹو پر اہلِ ادب سے نیا کام کرالیا۔ اس نمبر کو دیکھ کر ''لاہور کی اُجلی اُجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں'' بھٹکتی ہوئی منٹو کی روح ضرور خوش ہوئی ہوگی۔ اس مرتبہ لاہور نے بھی منٹو کو بروقت یاد کیا۔ قاضی جاوید صاحب نے ایک تقریب اکادمی ادبیات میں منعقد کی، سرفراز سیّد نے ایک مذاکرہ روزنامہ ''خبریں'' میں کرایا جس میں منٹو کی تینوں بیٹیوں نے شرکت کی، چند اخباروں نے منٹو کا ذکر ادبی صفحے پر کیا اور نوید دی کہ پچاس برس گزرنے کے بعد منٹو کا پی رائٹ کی پابندیوں سے آزاد ہو گیا ہے۔ اب اس کی نشاۃ ثانیہ زیادہ تزک و احتشام سے برپا ہوگی، مجھے تو یہ رسمی سی بات نظر آتی ہے کیوں کہ منٹو اپنی وفات کے بعد ادب کے منظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوا جب کہ ان کے متعدد معاصرین جن میں سے کوئی افسانے کا خود ساختہ شہنشاہ تھا، کوئی افسانے کا تاجدار تھا نظروں سے خود بخود اوجھل ہو گئے، جن افسانہ نگاروں کو منٹو نے ''خطوط'' سے تربیت دینے کی کوشش کی تھی، وہ اپنی زندگی میں اپنی فنی موت کا سامنا کر رہے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ بعض اصحاب اپنی عزت کی بحالی کے لیے ان عدالتوں میں پہنچے ہوئے ہیں جہاں منٹو پر فحاشی کے مقدمات چلائے گئے تھے اور آپ حیران ہوں گے کہ اپنی عزت کی قیمت بھی خود ہی مقرر کر لی ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد کا موضوع بالکل نیا ہے۔ سجاد شیخ صاحب کو منٹو سے گہری دلچسپی تھی، انہوں نے منٹو پر بہت سا مواد جمع کر رکھا تھا لیکن وہ اعلیٰ پائے کا کام انجام نہیں دے سکے، ممتاز شیریں نے منٹو کو دریافت کرنے میں اچھی کاوش کی۔ ان کی کتاب ''منٹو۔ نوری نہ ناری'' منٹو پر بنیادی مطالعے کی کتاب ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی ادب سے وابستگی ان کے شوہر صمد شاہین کے عدم تعاون کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تھی۔ بیگم نظیر صدیقی کے ایک مضمون اور نثار عزیز بٹ کی خودنوشت سے بڑے دردناک واقعات سامنے آئے ہیں، میں انہیں مثالی جوڑا سمجھتا تھا اور اس کا ثبوت ان کا رسالہ ''نیا دور'' تھا جو دونوں میاں بیوی مل کر نکالتے تھے۔ تاج سعید نے ''قند'' کا ممتاز شیریں نمبر چھاپا تو اس میں ممتاز شیریں کے خطوط بھی شامل کیے جن میں انہوں نے صمد شاہین کی بے پناہ محبت کا بے ساختہ اعتراف کیا تھا لیکن آخری عمر میں وہ ایک دکھی خاتون تھیں اور صمد شاہین ان کی وفات کے بعد دوسری شادی کرنے والے تھے کہ بیگم نظیر صدیقی اور نثار عزیز بٹ نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ انوار احمد صاحب نے آخری ایام علالت میں ممتاز شیریں کی انتہائی افسردگی کا درست تذکرہ کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ''قند'' کے ممتاز شیریں نمبر میں مَیں نے صمد اور شیریں کو ایک مثالی جوڑا سمجھا تو منصور قیصر نے اعتراض کیا تھا کہ میں ان کے داخلی حالات سے

واقف نہیں تھا۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ اس پرچے میں منٹو پر ڈاکٹر علی ثناء شاکر کے دو مضامین شامل ہیں اور دونوں نیا مواد سامنے لائے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ زیورِ طبع سے کیوں آراستہ نہیں کرتے۔ ان کی کتاب نہ چھپنے سے منٹو کے بارے میں غلط فہمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ان سے یہ گزارش اس سے پہلے بھی کی تھی۔ ان سے آخری ملاقات مظفر علی سیّد کی وفات پر ہوئی تھی۔

ابن حسن صاحب کا مقالہ ''منٹو کا مسخ شدہ وژن'' اور ڈاکٹر قاضی عابد کا مقالہ ''منٹو پر چند ذہنی تنقیدی تحفظات'' ان کی منٹو شناسی کے مظہر ہیں لیکن ان کے سب نکات سے اتفاق کرنا ممکن نہیں، موخر الذکر نے اس بحث میں رحمان مذنب کو بھی گھسیٹ لیا ہے حالاں کہ وہ طوائف کی بجائے طوائف کے معاشرے کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کا مدارِ فن منٹو کے مدارِ عمل سے مختلف ہے۔ ان کا یہ اقتباس بڑا معنی خیز ہے: ''ناقدین کی ایک پوری نسل رحمان مذنب کو منٹو سے بڑا افسانہ نگار قرار دیتی ہے رحمان مذنب کو منٹو سے بڑا افسانہ نگار قرار دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی امجد طفیل کو حامد بیگ سے بڑا افسانہ نگار قرار دے دے اور موازنہ کے لیے ''انٹیک شاپ'' اور ''بابے نور محمدے کا آخری کبت'' چن لے۔''

اب پتہ نہیں کہ اس اقتباس پر ڈاکٹر پروفیسر مرزا حامد بیگ پی ایچ ڈی ناراض ہوتے ہیں یا امجد طفیل جو ابھی پی ایچ ڈی نہیں ہوئے کو غصہ آتا ہے۔ مجھے تو بنیادی طور پر ہر دو شاعروں یا دو افسانہ نگاروں کا موازنہ کرنا ہی درست رویہ نظر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں دریافت کیا جا سکتا ہے کہ غلام عباس کے ''اس بازار'' کے افسانے ''آنندی''، ''ناک کاٹنے والے'' اور ''اس کی بیوی'' کا موازنہ منٹو کے کس افسانے سے کریں گے؟ کیا آغا بابر کے افسانے ''گلاب دین چٹھی رساں'' کا موازنہ منٹو یا رحمان مذنب کے کسی افسانے سے کیا جا سکتا ہے؟ اس پرچے میں منٹو کے افسانے ''موذیل'' کا تجزیہ ڈاکٹر شگفتہ حسین اور ایم خالد ریاض صاحب نے کیا ہے اور دونوں کے مطالعے کے زاویے جداگانہ ہیں، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا تجزیہ خالد محمود سنجرانی نے کیا ہے۔ اس افسانے کا ایک تجزیہ فتح محمد ملک صاحب نے رسالہ ''دریافت'' میں کیا ہے، دونوں کے دریافت کے زاویے الگ الگ ہیں۔ محمود احمد قاضی نے منٹو پر دردمندی سے اور احمد صغیر صدیقی صاحب نے منٹو پر ذاتی تنومندی سے مقالہ لکھا ہے۔ دونوں کا تاثر جداگانہ ہے۔ تاہم یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ منٹو نے اپنے فن کے جو نقوش ۴۵ برس کی عمر میں نکھار دیئے تھے، آج اس کے زندہ معاصر نوے برس کی عمر میں بھی نہیں نکھار سکے اور اب اپنی شکست کی خود آواز بنے ہوئے زمانے کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور ان پر کرشن چندر کے سرقے کے الزام بھی عائد ہیں۔

احمد صغیر صدیقی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خطوط کے کالم میں ''جائزہ نگاری'' کے حوالے سے مجھے یاد فرمایا۔ شاید انہیں معلوم نہیں کہ میں ۷۷واں عبور کر چکا ہوں۔ اب ''نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں'' اپنے اخبار سے ریٹائرمنٹ لے لی ہے اور زندگی کے بونس کو استعمال کر رہا

ہوں۔ ''صریر'' کے ساتھ ''تخلیق'' کی جائزہ نگاری بھی وقت کے جبر کے تحت چھوٹ گئی ہے۔ یہ کام اب احمد صغیر صدیقی صاحب کو کرنا چاہیے جو اپنی تحریروں سے جوان بلکہ نوجوان نظر آتے ہیں اور ستاروں پر مسلسل کمندیں ڈال رہے ہیں۔

منٹو نمبر ملا تو دل اس قدر خوش ہوا کہ فوراً رسید بھیجنے پر آمادہ ہو گیا۔ آخر میں یہ افسوس ناک خبریں سن لیجیے کہ راولپنڈی میں معروف افسانہ نگار شمس نعمان فوت ہو گئے، لاہور میں ایک جواں عمر شاعر غضنفر علی ندیم وفات پا گئے، وہ حلقہ تصنیف ادب میں مشاعرہ میں شامل تھے، اٹھ کر کمرے میں گئے تو وہیں برین ہیمریج ہو گیا، تین چار دن کے بعد اس دنیا ہی کو چھوڑ گئے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ انہیں علاج معالجے کی سہولتیں بھی میسر نہیں ہوئیں جب کہ پچھلے دنوں اشتہاری شہرت سے نام کمانے والے ایک کالم نگار بیمار ہوئے تو گورنر پنجاب انہیں گلدستہ پیش کرنے کے لیے ہسپتال گئے، وزیر اعلیٰ پنجاب نے ان کی عیادت کے لیے اپنا ایک خاص ایلچی بھیجا، جس نے ان کو پھول پیش کیے۔ عرض کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ سرکار کے کھاتے میں کیا ادیبوں کے لیے بھی ذات پات اور امیر و غریب کی تمیز قائم ہے؟ پچھلے دنوں لاہور میں خبر گرم تھی کہ ایک معروف بوڑھے شاعر کی صدر مملکت نے اس کے مقام اور مرتبے کے مطابق پذیرائی نہیں کی بلکہ مبینہ طور پر کاغذ کا ایک پرزہ بھیج کر اشک شوئی کر دی۔ لاہور سے اس رویے پر صرف اظہر جاوید نے احتجاج کیا، سنا ہے کہ شاعر موصوف الٹا اظہر جاوید سے ناراض ہو گئے ہیں اور انہیں ایک نوٹس بھیج دیا ہے۔ بہت عرصہ پہلے اکادمی ادبیات پاکستان نے ادیبوں کی بیمہ سکیم جاری کی تھی، کچھ ادیبوں کو پالیسی کے کاغذات بھی بھجوا دیئے تھے لیکن پھر یہ سکیم خدا جانے کہاں چلی گئی۔ اب خوف ناک صورت یہ ہے کہ جب کوئی ادیب غربت اور ناداری کی حالت میں مرتا ہے تو ہم اس کے بچوں کی کفالت کے لیے اپیلیں کرنے لگتے ہیں۔ کیا صدرِ مملکت کا یہ فرض نہیں کہ وہ دو چار بڑے ادیبوں ہی کی پذیرائی نہ کریں بلکہ ادب کے ہر خدمت گزار کو جو علالت اور بیماری کا شکار ہے کم از کم علاج کی سہولت تو فراہم کریں۔ ''انگارے'' کی وساطت سے میں یہ سوال پوری ادیب برادری سے کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور)

''انگارے'' کے ''منٹو نمبر'' کی اشاعت نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا ہے کہ منٹو زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ آپ کی یہ کاوش اندرون ملک ہی نہیں بیرون ملک بھی علمی اور ادبی حلقوں میں تحسین کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ آپ داد اور رمبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس سے قبل مختلف رسائل نے جتنے بھی ''منٹو نمبر'' شائع کیے، ''انگارے'' کا یہ شمارہ اس لحاظ سے معتبر ہے کہ اس میں عصر عاضر کے ادبی اور تنقیدی تقاضوں کے مطابق منٹو کو نئے سرے سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مضمون نگاروں کے خیالات سے اگرچہ اختلافات کی گنجائش موجود ہے

لیکن تقریباً سبھی نے لگی لپٹی کے بغیر، فکری اور تحقیقی انداز میں منٹو پہ قلم اُٹھایا ہے۔ حواشی و حوالہ جات، جریدے کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ کا باعث ہوئے ہیں۔ تقریباً تمام مضامین لائقِ تحسین ہیں لیکن ڈاکٹر انوار احمد کا مضمون ''سعادت حسن منٹو کے اداس اور تنہا متخصص'' جدت اور سچائی کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر سجاد شیخ، ممتاز شیریں، انیس ناگی اور ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے بارے میں اُنہوں نے قارئین سے سچ سچ ایسی دوٹوک باتیں کی ہیں جن سے اختلاف ممکن نظر نہیں آتا۔

منٹو پہ ڈاکٹر بخاری کے مقالے کی اشاعت میں تاخیر کی بابت ان کی یہ سوچ ___ ''میں نے خیال کیا کہ وہ پاکستان کی ہیئت حاکمہ کی منشاء سے سمجھوتہ کر کے عدالتی نظام کے مناصب کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہوں گے، تاہم اس سے تعجب ضرور ہوتا تھا کہ منٹو کی شخصیت اور فن پر اس قدر انہماک سے کام کرنے والے نے عملی ذہانت کا مظاہرہ کر کے زمینی حقائق کس طرح قبول کر لیے؟ ۲۰۰۳ء کے اوائل میں ایک خبر چھپی کہ ڈاکٹر علی ثناء شاکر بخاری کو ملازمت سے برخواست کر دیا گیا ہے، ڈاکٹر بخاری اور ان کے افرادِ خانہ کا رنج اور صدمہ اپنی جگہ مگر تخلیقی دنیا میں یہ خبر جس حوالے سے قبول کی جانی چاہیے، اس کی جانب یہ مضمون اشارہ کر رہا ہے۔'' ___ منٹو کے اندازِ فکر اور اثر کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرنے کے مترادف ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ''منٹو کی شخصیت اور فن پر اس قدر انہماک سے کام کرنے والا''، ''پاکستان کی ہیئت حاکمہ کی منشاء سے سمجھوتہ'' کر ہی نہیں سکتا، ڈاکٹر انوار احمد کی ذہنی اپج کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر بخاری پر تین بڑے الزام تھے۔ ملکی انتخابات کرانے سے انکار، ہائی کورٹ کی توہین کا ارتکاب اور پھر توہینِ عدالت کے ارتکاب پر معافی مانگنے سے انکار۔ چودہ سال مسلسل اپنے مؤقف اور اصول پر قائم رہ کر، کسی بھی طرح کا سمجھوتا نہ کر کے ڈاکٹر بخاری نے وہ روایت قائم کی ہے جس کی مثال ''پاکستان کی ہیئت حاکمہ'' میں نہیں ملتی۔ شاید یہ منٹو کا ہی اثر ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کے خیال کی تصدیق میں، یہاں میں ڈاکٹر بخاری کے خلاف توہینِ عدالت کی کارروائی سے متعلق، لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژن بینچ کے فیصلے کے چند اہم حصوں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

... Appellant's counsel argue case for two or three dates of hearing justifying action of his client who was ready always to whisper instructions in his ear. Observed that not even a remote purge or remorse has been shown, so as to relieve contemnor from charges, therefore, no leniency can be shown in the matter of punishment. .....Held: that this mode was adopted to satiate ill-founded belief entertained by Appellant against Respondents and two other judges that it was due to them that sufferings had been showered on him and through sinister insinuation he wanted to hit back but in doing so HE INCURRED WRATH OF INSTITUTION. (PLJ 2002, Cr.C.(Lahore) 1522(DB).

سرکاری نوکری سے فراغت کے بعد، ڈاکٹر بخاری نے ایڈووکیٹ کی حیثیت سے انرولمنٹ کے لیے پنجاب بار کونسل میں اپنے کاغذات داخل کیے۔ انرولمنٹ کی راہ میں بعض اوقات ملازمت سے برخاستگی، حائل ہو سکتی ہے مگر انہیں بحیثیت ایڈووکیٹ بار کی رکنیت دی گئی اور پنجاب بار کونسل کے ٹریبونل نے ان کے بارے میں فیصلہ صادر کرتے ہوئے جلی حروف میں لکھا:

... S. 2-6(2) Respondent's application for enrollment as an Advocate... Respondent having served as judicial officer for 23 years was dismissed frrom service after his conviction in contempt case by the High Court. High Court had dismissed respondent from service on account of his conviction for an offence allegedly involving moral turpitude. Respondent having been convicted in contempt case, his case was not covered by the term moral turpitude. Respondent's case was not hit by the provisions of S.26(2) of Legal Practitioners and Bar Council Act, 1973. Application submitted by Respondent for enrollment as an Advocate was directed to be processed and submitted before enrollment committee without loss of time. Bar Council observed that respondent having served for about 23 years as a judicial officer not even a single negative word heard against him from any member of Bar till to date regarding his conduct, integrity and performance of duties as judicial officer. Respondent was, thus, upright and honest judicial officer. (PLJ 2002 Tr.C.(ACC)19)

ڈاکٹر بخاری عدلیہ کی وہ شاخ ہے جسے جھکانا ناممکن مگر کاٹنا آسان ہے۔ میں ڈاکٹر انوار احمد کو مبارک پیش کرتا ہوں کہ ہم نے ان کا ریسرچ سکالر، ''تخلیقی دنیا'' کو لوٹا دیا لیکن قانون اور انصاف سے تعلق رکھنے والوں کو ہمیشہ قلق رہے گا کہ ہم نے ایسا جج کھو دیا جس کی عدالت میں دادرسی کے لیے پیش ہوتے ہوئے کسی مفلس اور بے کس کو یہ خوف دامن گیر نہیں ہوتا تھا کہ اس کا مخالف فریق انتہائی بااثر یا صاحب ثروت ہے۔

(طالب حیدر رضوی۔ لاہور)

منٹو نمبر موصول ہوا۔ منٹو سے متعلق مجید امجد کی نظم کی اشاعتِ مکرر مزہ دے گئی۔ یہ نظم اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ مجید امجد کا وہ اسکیچ جو انور جلال شمزا نے بنایا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کا تحریر کردہ منٹو کی مکتوب نگاری سے متعلق مضمون احمد ندیم قاسمی صاحب کے ٹخنوں پر مکہ بازی کی مشق معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ پورے قد کے ساتھ کھڑے احمد ندیم قاسمی کے ٹخنوں تک ہی رسائی ممکن تھی۔

یہ کون نہیں جانتا کہ ۱۹۴۸ء میں منٹو نے محمد حسن عسکری صاحب کے ساتھ مل کر ''اُردو ادب''

جاری کیا تھا اور اُس پرچے کے دونوں شماروں میں ترقی پسندوں پر سنگ باری کی گئی تھی۔ اگر ایسے میں منٹو کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کی نظریاتی جنگ چھڑی اور بشمول ممتاز مفتی، منٹو پر بھی ترقی پسند پرچوں کے دروازے بند ہوئے تو ڈاکٹر انور سدید کی جانب سے منٹو کو ترقی پسند تحریک اور احمد ندیم قاسمی کے مقابلے میں مظلوم بنا کر پیش کرنے کی اس کوشش کو کیا نام دیں گے؟ لاعلمی یا کچھ اور؟؟

مضمون نگار کا یہ بیان ملاحظہ ہو: ''ان خطوط (منٹو کے خطوط ندیم کے نام) کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے بعض خدوخال کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور یہ بین السطور مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ منٹو نے اُن کی ناکام تحریروں کی طرف جا بجا اشارے کیے ہیں۔۔۔ انہیں جذبات زدہ قرار دیا ہے۔۔۔'' (ص:۱۵)

گویا مضمون نگار، منٹو کے ناکام اور پھسپھسے افسانوں کا تو مداح ہے لیکن اُس کی محبت احمد ندیم قاسمی سے اتنی زیادہ ہے کہ ابتدائی دور میں بھی احمد ندیم قاسمی کے قلم سے کوئی کمزور تحریر اُسے گوارا نہیں۔ گزشتہ پرچے میں بین السطور محمد علی صدیقی صاحب نے یوں ہی تو نہیں لکھا تھا کہ ''انگارے'' (جس کی پیشانی پر ''ترقی پسند ادب کا ترجمان'' درج ہے) میں معتبر ترقی پسند قلم کاروں کا مونہہ چڑایا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر علی ثناء شاکر بخاری کے دونوں مضامین حد درجہ اہم ہیں۔ اے کاش اُن کا منٹو سے متعلق ڈاکٹریٹ کا مقالہ جلد شائع ہو جائے۔ اس سے بہت سے مباحث پھوٹیں گے۔ شامل کردہ افسانوں کے تجزیے بھرپور تو نہیں لیکن اچھے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد نے منٹو کے تین متخصص (ممتاز شیریں، سجاد شیخ اور انیس ناگی) زیر بحث لا کر مجھے تو ایک نیا زاویہ نظر فراہم کر دیا۔ کتنی حیران کن بات ہے کہ منٹو کی طرح بطور ایک شخصیت، موضوع کے طور پر مجید امجد کا بھی یہی معاملہ ہے اور احمد ندیم قاسمی کا بھی۔ مجید امجد پر بات کریں گے تو مظفر علی سید اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے اہم ناموں کے ساتھ انیس ناگی ہی کی طرح کا ایک نام زیر بحث لانا پڑے گا جب کہ احمد ندیم قاسمی کے واحد متخصص کا بھی خیر سے وہی حال ہے۔

یہ صورتِ احوال دیکھ کر خیال آیا کہ صوفیاء کرام ایک اصطلاح برتتے ہیں: ''مدارات و مداہنت'' کی، تو کتنا اچھا کرتے ہیں۔ راہِ سلوک میں مدارات کا حاصل بہ یک وقت اہلِ جہل اور اہلِ شر سے نرمی برتنا ہے، تاکہ اہلِ جہل، دینِ متین کی طرف راغب ہوں نیز اہلِ شر کے شر سے بچا جا سکے۔

ڈاکٹر انوار احمد اِس باب میں کیا کہتے ہیں، مجھے نہیں معلوم، مجھے تو اتنا پتا ہے کہ ڈاکٹر انوار کی اِس نوع کی نظریہ سازی کے تحت مظفر علی سید اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسے سقہ ناقدین کے ساتھ اہلِ جہل اور شری کرداروں کا نام لینا بھی مدارات جیسا فعل ہی ہے۔ بے شک اِس نوع کی نرمی برتنے کا ایک فائدہ اور بھی ہے کہ احیاناً طاعت میں اور اکثر تبلیغ میں جو خلل پڑ جاتا ہے اُس سے بچا جا سکے۔ میں اپنے بارے میں شائع شدہ ایک پورے مضمون اور ''لمرک فیم'' ڈاکٹر انور سدید کے خط کا جواب نہیں لکھ رہا۔ اس لیے کہ اُس سے طاعت و تبلیغ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔

(مرزا حامد بیگ، لاہور)

میں جس طرح قلم برداشتہ لکھتا ہوں آپ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ 'انگارے' کی گزشتہ اشاعت میں میں نے عنوان میں منٹو کے تین متخصصین کے پیشِ نظر رکھنے کی بجائے چوتھے جناب انیس ناگی کا بھی ذکر کر ڈالا اور ان کی شخصیت کے حوالے سے ایک آدھ بات ایسی لکھی تھی جسے لکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ خاص طور پر انھیں بدمزاج کہنا جب کہ میری اُن سے محض ایک ملاقات ہوئی اور وہ بھی سرسری۔

البتہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے اس مضمون کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر علی ثنا شاکر نے فون کر کے بتایا کہ وہ ایف۔سی کالج کے شعبہ اردو میں ہیں۔ مجھے دلی خوشی ہے کہ ایک پڑھا لکھا شخص ایک محکمے سے رنج سہتا بالآخر ایک علمی ادارے سے وابستہ ہے۔

(ڈاکٹر انوار احمد۔ ملتان)

''انگارے'' کا منٹو نمبر مل گیا تھا۔ اس کو جستہ جستہ دیکھ رہا ہوں، آپ کی سعی و کاوش قابل داد ہے۔ آپ نے اتنے کم وقت میں ایک ایسے موضوع پر نئے مضامین فراہم کئے ہیں جس کا ابھی تک ہم نے حق ادا نہیں کیا۔ یوں تو ہمارے یہاں یہ روش عام ہے کہ فضول موضوعات پر مقالوں اور کتابوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں مگر منٹو کا اس طرح مطالعہ نہیں کیا گیا جتنا کہ اس کا حق تھا۔ نقاد لوگ شاید منٹو سے اب بھی ڈرتے ہیں اور غالباً یہ بات بھی ہے کہ منٹو ایسا ادیب ہے کہ اتنی آسانی سے ''موضوع'' نہیں بنتا، اپنے بارے میں لکھنے والے کا پول کھول دیتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ آپ کے پرچے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جو شاید عجلت یا رواروی میں لکھا گیا ہے، لیکن کئی مضامین ایسے ہیں جن کا حوالہ آگے چل کر بھی مفید ثابت ہوگا۔ اس لئے کیوں نہ آپ اس شمارے میں ترمیم و تنسیخ کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کر دیں، یہ کام منٹو شناسی میں آپ کا ایک اور contribution ہوگا

(آصف فرخی۔ کراچی)

رسید اور اطلاع:

محمد سلیم الرحمٰن (لاہور) قاضی جاوید (لاہور) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی) ڈاکٹر یونس جاوید (لاہور) پرویز ساحر (ایبٹ آباد) ڈاکٹر رشید امجد (راولپنڈی) غلام حسین ساجد (لاہور) ڈاکٹر معین الرحمٰن (لاہور) افتخار عارف (اسلام آباد) ڈاکٹر علمدار حسین بخاری (سرگودھا) ناصر حسین بخاری (اسلام آباد) ڈاکٹر غفور شاہ قاسم (میانوالی) ظفر اقبال نادر (عارف والہ) قاضی عطا الرحمٰن (عارف والہ) حصیر نوری (کراچی) روش ندیم (راولپنڈی) طاہر نقوی (کراچی) زاہد حسین زاہد (پاک پتن) جمشید ساحل (لیہ)

☆☆☆